خامہ تلاشی

ابوالفیض معینی

ادارۂ فکر اسلامی، دہلی

Khama Talashi
By: Abul Faiz Moini
First edition:December 2009
Second edition: April 2014
Price:

Idara-e-Fikre Islami,Delhi
Distributed by:Maktaba Jaam-e-Noor
422 Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi-6
Phone:011-23281418
email: ifikreislami@gmail.com

انتساب



ماہنامہ جام نور کے مدیر اعلیٰ اور میرے دوست

خوشتر نورانی

کے نام

جن کی فرمائش پر یہ کالم لکھا گیا

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرگزشت رقابت

مولانا اسید الحق اور میری علمی وفکری نوک جھونک کو دیکھ کر ذیشان احمد مصباحی ازراہ مذاق کہتے ہیں کہ ''دنیا آپ دونوں کے کاموں کا اعتراف کررہی ہے، مگر آپ دونوں اب تک ایک دوسرے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے''- ذیشان مصباحی کے اس جملے کا میں نے تو نوٹس نہیں لیا، لیکن شاید اسید الحق صاحب نے اسے نہایت سنجیدگی سے لیا اور میرے قلم سے اپنی وسعت علمی کے اعتراف کے لیے یہ سازش رچی کہ اس کتاب کا انتساب میرے نام کردیا- اب میرے لیے کوئی چارہ نہیں کہ قلم کی امانت اور راست گوئی کا تقاضا ہے کہ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا خاموشی سے اعتراف کرلیا جائے، لیکن ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے لیے علم وفضل کے ساتھ وسیع الخیالی لازمی ہے جو فی الحال مجھ میں مفقود ہے، اس لیے شاید میں ایسا نہ کرسکوں، پھر بھی ان کی محبت مجھ سے یہ کام کروالے تو یہ ان کی کرامت ہوگی- ویسے جس کے علم وفن کی دھوم برصغیر ہندو پاک میں مچی ہو اور جس کی خامہ تلاشی کو اہل علم نے فیضی کی بانگ درا، مشفق خواجہ کے خامہ بگوش، شورش کے قلم قتلے، آزاد کی غبار خاطر اور ظفر علی خاں کے مطائبات سے تشبیہ دی ہو، اس کے بعد مجھ جیسے نو آموز کے اعتراف کی حیثیت ''یہ منہ اور مسور کی دال'' کی رہ جاتی ہے، مگر پھر بھی انھیں اپنی صلاحیتوں کے اعتراف کی آڑ میں میرے قلم کی درازی قامت کا بھرم کھولنے کی ضد ہے- اب جبکہ اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو پھر موسلوں سے کیا ڈر؟

آج سے اٹھارہ برس قبل ۱۹۹۱ء میں میرے دادا محترم نے مجھے امام علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین صاحب سے اکتساب علم کے لیے مدرسہ قادریہ بدایوں بھیجا، اس وقت میری عمر کوئی پندرہ سولہ برس رہی ہوگی، اس بے ریشی کی عمر میں نہ تو خانوادۂ عثمانی کی علمی جلالت وشوکت کا اندازہ تھا، نہ مدرسہ قادریہ کی درسگاہی قدامت اور مرکزیت کا علم اور نہ

ان دونوں سے تاریخ کے بے رحمانہ سلوک کا سراغ-اس عہد ناواقفیت میں پہلی بار اس مدرسے میں اپنی ہی عمر کے ایک وجیہ اور پروقار نوجوان کو دیکھا، دیکھتا رہ گیا- چہرے پر بلا کی جاذبیت نے مجبور کیا کہ اس کا اتا پتا معلوم کروں، معلوم ہوا کہ یہ حضرت صاحب سجادہ کے فرزند اسید الحق ہیں، جنھیں پیار سے احباب واقارب اور مریدین ومتوسلین ''بھیا'' کہتے ہیں- مجھے چہرہ شناسی کا علم نہیں اور نہ قیافہ شناسی کا دعویٰ، مگر ان کی آنکھوں میں تیرتی ذہانت، چہرے پر پروقار تمکنت اور پیشانی سے پھوٹتی خاندانی مجد وشرافت کی کرن نے دل میں اسی وقت مجھ سے سرگوشی کی کہ یہ نوجوان آگے چل کر یقیناً ایک نئی تاریخ رقم کرے گا، حالانکہ معاصرانہ رقابت اس وقت سے اب تک اس سرگوشی کی نفی کرتی رہی ہے، لیکن حقیقت کو جھٹلانے سے تاریخ نہیں بدلا کرتی- یہ معاصرانہ رقابت بنام رفاقت کا ہی کمال ہے کہ اس وقت سے اب تک ان کی ہمسری کی کوشش کررہا ہوں، لیکن وہاں تک نہیں پہنچ سکا جہاں دل کو اطمینان ہو جایا کرتا ہے، کیونکہ اس وقت ان کی علمی وفکری اٹھان کا حال غالبؔ کے لفظوں میں کچھ یوں تھا......ع

اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

اور اب حال یہ ہے:

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اس لیے اب ہتھیار ڈالنے کی کوشش میں ہوں، کیونکہ عقل مندی اسی میں ہے کہ موج دریا کا حریف ہونے کی بجائے ساحل میں عافیت تلاش کر لی جائے-

بدایوں کے اپنے تقریباً دوسالہ قیام کے بعد میں گھوسی چلا گیا اور وہاں سے کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ، لیبیا، جبکہ مولانا اسید الحق حضرت امام علم وفن کی خدمت میں چرہ، محمد پور، فیض آباد چلے گئے اور وہاں سے علم وفن کے نئے آفاق کی تلاش میں جامعہ ازہر مصر- برسوں ہمارے درمیان کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رہا، اس عدم ربطگی کی وجہ تعلیمی انہماک بھی تھی اور معاصرانہ رقابت میں اول آنے کی ہوڑ بھی-۲۰۰۳ء میں جب میں صحافت کے فن میں بازو آزمانے کی کوشش کررہا تھا اور اس میڈیم سے جماعت اور ملت کی زلف پریشاں کو

سنوارنے میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا، پرانے اور دیرینہ تعلقات پھر استوار ہوئے۔تعلقات کی اس استواری کے بعد اپنی صلاحیتوں سے انھوں نے مجھے کئی بار جھٹکے دینے کوشش کی، لیکن ہم بھی ایک ہی ٹھہرے، اس بات کو اتنی آسانی سے کیسے تسلیم کر لیتے کہ اٹھارہ برس قبل جس نوجوان کا محض چہرہ دیکھ کر اس کی بلند اقبالی کی دل نے سرگوشی کی تھی، وہ نئی تاریخ رقم کرنے کے لیے پوری طرح علم وفن اور زبان وقلم سے لیس ہو چکا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص میں علم حدیث، تفسیر، منطق وفلسفہ، تاریخ، زبان وادب، شعر وسخن، خطابت وقلم اور عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں مہارت کی یکجائی عنقا ہے۔اگر کسی میں ہو تو یہ یکجائی شخصیت کی جامعیت کی توثیق کرتی ہے۔ایسی گونا گوں اور جامعیت کی حامل شخصیت کے لیے لغت میں لفظ ''عبقری'' ملتا ہے، جسے اسید الحق صاحب کی طرف اگر کوئی منسوب کرے تو کم از کم مجھ سے توثیق کی امید نہ رکھے۔ویسے 'خامہ تلاشی' کو پڑھ کر بڑے بڑے فاضلین علوم اسلامیہ نے یہ ریمارک دیا ہے:

''یہ کسی ایک شخص کا کارنامہ نہیں، بلکہ چند ماہرین فنون کی کوششوں کا نتیجہ ہے''۔

اب ہم ٹھہرے موروثی مقلد، بڑوں کی تمام باتوں کو ٹھکرا دینا بھی ہمیں زیب نہیں دیتا۔

۲۰۰۵ء کے اوائل میں جام نور کے ذریعے نئی نسل کی علمی، فکری اور قلمی رہنمائی کے لیے جب میرے ذہن میں ایک نئے کالم 'خامہ تلاشی' کا پلاٹ تیار ہو رہا تھا تو اس کی انجام دہی کے لیے سب سے مشکل مرحلہ تھا ''شخصیت کا انتخاب''۔میں نے سوچا، مذہبی ادب میں نقد ونظر تلوار کی دھار پر چلنے کا فن ہے، اس کے لیے بصیرت، ظرافت، اور گہری نظر کے ساتھ جملہ علوم متداولہ اور زبان و بیان پر درک ہونا چاہیے اور اس دور قحط الرجال میں بظاہر ایسی صفتوں پر مشتمل شخصیت کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔اس تعلق سے میں نے بہت غور وفکر کیا، لیکن حیرت ہے کہ جب جب غور کرتا تو گھوم پھر کر ایک ہی شخص ذہن کی اسکرین پر جم جاتا، وہ شخص کوئی اور نہیں اسید الحق تھے۔اس خیال کو کئی بار ذہن کے پردے سے ہٹانا چاہا، لیکن ہر بار وہ منہ چڑھاتے نظر آئے، بالآخر پریشان ہو کر میں نے

اپنے دل کوتسلی دی کہ ایسا ان کے علم وفضل کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ رفاقت اپنا حق طلب کررہی ہے- اس خیال نے کسی قدر مجھے پرسکون کردیا اور پھر پیہم اصرار کے بعد بعض تحفظات اور وجوہات کے پیش نظر اسید الحق صاحب 'ابوالفیض معینی' کے نام سے خامہ تلاشی لکھنے پر آمادہ ہو گئے-

خامہ تلاشی لکھنے کا آغاز اپریل ۲۰۰۵ء سے ہوا اور دسمبر ۲۰۰۶ء تقریباً پونے دو سال تک یہ سلسلہ چلا اور پھر بند کر دیا گیا- اس کی موقوفی کی وجہ خود خامہ تلاش نے اپنے انٹرویو میں جو بیان کی ہے، وہ یہ ہے: ''اس کالم کا بنیادی مقصد زبان وقلم اور علم وفکر کے حوالے سے نئی نسل کے شعور کو بیدار کرنا تھا، اللہ کا شکر ہے یہ شعور ان میں بیدار ہو چکا، اس لیے محض اپنے مبلغ علمی کے اشتہار کے لیے اس کو مزید جاری رکھنا مناسب نہیں''-

اس دوران برصغیر ہندو پاک میں بقول حضرت سید محمد اشرف مارہروی ''خامہ تلاشی نے قارئین کے دل میں جیسی جگہ بنائی اس کی مثال عنقا ہے''- شاید قارئین کے درمیان اس کالم کی بے پناہ مقبولیت نے ہی ابوالفیض معینی کو ایک معمہ بنا کر رکھ دیا اور جام نور کا حلقہ وسیع تر ہوتا چلا گیا- خامہ تلاشی کا جس وقت آغاز کیا گیا، اس وقت نہ تو مجھے اور نہ ابوالفیض معینی کو اپنے بارے میں یہ اندازہ تھا کہ محض اس کالم سے بقول ظ- انصاری ''خوابوں کی وہ پری جسے کامیابی کہتے ہیں جب کسی نوجوان پر مہربان ہوتی ہے تو اسے اپنے اڑن کھٹولے میں سوتے سے اٹھا کر لے جاتی ہے، پھر برسوں تک اسے اپنا سراغ نہیں ملتا''- ویسے ابوالفیض معینی کی اس کامیابی کے لیے اس کے بنیاد گزار کی حیثیت سے اگر کوئی صاحب مجھے ہدیہ تبریک یا کریڈٹ دینا چاہیں تو مجھے کوئی تامل نہیں ہوگا کہ مجھے اپنے باذوق قارئین سے اسی انصاف کی امید بھی ہے-

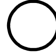
خامہ تلاشی کو بند ہوئے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر قارئین اس کالم کو فراموش کرنے کو تیار نہیں ہیں، اس لیے ان کی تسکین اور موجودہ نوآموز نیز مستقبل میں پیدا ہونے والے اہل قلم کی شعور کی بیداری کے لیے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے، اگر زبان وقلم کے ماہرین کو ڈاکٹر شرر مصباحی کی طرح ''خامہ تلاش کا انتقادی قلم علم سے زیادہ پندار

علم کا ڈھنڈورچی'' نظر آئے تو اس کے لیے جام نور کے صفحات حاضر ہیں۔اخیر میں ہم خامہ تلاش کے لے علامہ محمد احمد مصباحی کے دل سے نکلی اس دعا پر آمین کہہ کر رخصت چاہتے ہیں، کیونکہ ایمان کا تقاضا ہے ایک مومن کے لیے دل میں رقابت اور تعصب کا جذبہ نہ رہے۔''مولیٰ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم میں ان کے امثال زیادہ فرمائے'' ۔

خوشتر نورانی

۱۸/دسمبر ۲۰۰۹ء

اپریل ۲۰۰۵ء



کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

ہمارے دوست خوشتر نورانی صاحب نے جب نقد و نظر اور تنقید و تبصرہ کا کانٹوں بھرا تاج ہمارے سر پر رکھ کر ہمیں جام نور کے ۳ رصفحات کا بلاشرکت غیر مطلق العنان فرماں روا بنانے کی تجویز رکھی تو ہم نے یہ شرط لگادی کہ ہم پورے رسالہ پر تنقیدی نظر ڈالیں گے جس میں آپ کا اداریہ اور ادارتی نوٹ بھی شامل ہے اور اگر ان دونوں میں بھی ہمیں کوئی فکری یا لسانی فروگذاشت نظر آئی تو ہم اس پر بے لاگ اظہار رائے سے خود کو روک نہیں پائیں گے اور جس دن آپ نے ہمارے کسی ایسے تبصرے کو شائع کرنے میں پس و پیش کیا جس میں آپ کی فکر یا تحریر پر تنقید کی گئی ہو تو آپ سمجھ لیں کہ وہ ہمارا آخری تبصرہ ہوگا، اب وہ خوشتر ہی کیا جو تنقید سے گھبرا جائے؟ انھوں نے ہماری شرط تسلیم کر لی اور ہم نے ان کی تجویز-

ہم یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ ہماری یہ سطور بھی نقد و نظر اور تنقید و تبصرہ سے بالاتر نہیں ہیں، ہماری کسی بھی رائے سے اختلاف و اتفاق کا حق ہمارے قارئین کو حاصل ہے- کسی معقول گرفت اور سنجیدہ تنقید پر ہم اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنے کو ہر وقت تیار ہیں-

جام نور مارچ ۲۰۰۵ء کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، اداریہ کا عنوان ''اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی لذت پہلے'' اداریہ کے موضوع اور اس کے مشمولات سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتا، ''مسلم پرسنل لاء بورڈ جدید کی تشکیل اور اس کے مضمرات کا ایک تفصیلی جائزہ'' کی ذیلی سرخی کے تحت چیف ایڈیٹر نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے تو (انتہائی معذرت کے ساتھ) یہ مصرعہ زیادہ مناسب تھا ''زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن'' اداریہ میں جو تمہیدی گفتگو کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوشتر صاحب اس موقف کے حامی ہیں کہ جماعت اہل سنت کو ایک ایسی تنظیم کی بہر حال ضرورت ہے جو اسلام کے عائلی اور شرعی قوانین کا تحفظ اور

ملک کی سیاست میں حصہ داری کا مطالبہ کر سکے-مگر جس طرح یہ تنظیم بنائی گئی ہے اس کے طریقۂ کار سے خوشتر صاحب کو اتفاق نہیں، ہمیں اس موقف کو تسلیم کرنے میں تھوڑا تأمل ہے، اس پر جماعت کے اکابرین اور دانشوران کو ابھی مزید غور کرنا چاہیے کہ کیا واقعی حکومت کے مقابلہ میں اپنے اس قسم کے مطالبات پیش کرنے کے لیے جماعت اہل سنت کو اپنی الگ تنظیم کی ضرورت ہے یا پھر ملی اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مسلکی تشخصات وتحفظات کے ساتھ بنام اسلامیان ہند، تمام مسالک اور مکاتب فکر کا ایک اہم مشترکہ پلیٹ فارم ہونا چاہیے؟ اداریہ کے بعد ''الحاد سے ایمان تک'' کی دوسری اور آخری قسط شائع کی گئی ہے-ڈاکٹر لینگ نے اپنی تلاش حق کے سفر کی روداد بڑے دلچسپ اور دلکش انداز میں بیان کی ہے، ان کی یہ داستان دلوں کو چھو گئی-اس ترجمہ کے بارے میں خوشتر صاحب نے ہم سے کہا کہ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ترجمہ اس فنی مہارت سے کیا گیا ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ کسی تحریر کا ترجمہ ہے بلکہ یہ بجائے خود شگفتہ، سلیس اور رواں دواں نثر کا بہترین نمونہ ہے، چلیے ہم بھی خوشتر صاحب کی اس بات سے اتفاق کیے لیتے ہیں-

تحریری مباحثہ میں ''کیا اسلامی وضع قطع ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟'' کے عنوان سے مولانا فیضان المصطفیٰ صاحب، مولانا سجاد عالم صاحب اور مولانا ذیشان احمد صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے-فیضان صاحب کی تحریر ان کی روشن خیالی (جو بڑی خوش آئند ہے) اور سجاد صاحب کی تحریر ان کی فکری پختگی کی غمازی کرتی ہے، ذیشان صاحب کی تحریر بھی قابل مطالعہ ہے، فیضان صاحب نے اسلامی وضع قطع کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان میں ایک خصوصیت کفار سے عدم تشبہ بھی ہے، اسی طرح جناب سجاد صاحب نے بھی حدیث پاک '' من تشبہ بقوم فھو منھم'' کا ذکر کیا ہے-یہاں قدرتی طور پر ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا مطلقاً کفار سے تشبہ غلط ہے؟ (خواہ تشبہ کی نیت ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ تشبہ دنیاوی معاملات یا زندگی گزارنے کے عام طریقوں سے متعلق ہو) یا پھر تشبہ ان امور میں منع ہے جو کفار کے دینی اور مذہبی شعائر اور خصوصیات کے دائرہ میں آتے ہیں، اسی طرح اسلامی وضع قطع اور اسلامی تہذیب کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ سوال

بھی اٹھایا جاتا ہے کہ عربی تہذیب وتمدن اور اسلامی تہذیب وتمدن دونوں ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں؟ یا پھر اسلامی تہذیب اپنے مفہوم اور معنی کی گہرائی کے اعتبار سے اس مخصوص عرب کلچر کے مفہوم سے وسیع تر ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے رائج تھا- مثال کے طور پر میز، کرسی کی بجائے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھانا، اس کو آپ اسلامی تہذیب کہیں گے یا عربی تہذیب؟ کیا ایک نومسلم امریکن سے یہ مطالبہ ہونا چاہیے کہ وہ اسلام لاتے ہی میز کرسی کو چھوڑ کر فرش پر بیٹھ کر کھانا شروع کر دے؟ یہیں سے ایک بنیادی سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر تہذیب وتمدن یا وضع قطع مذہبی عناصر سے ترکیب پا کر وجود میں آتے ہیں یا اس کی جڑیں علاقہ، خطہ اور قومیت سے جا کر ملتی ہیں؟ ان اہم سوالات پر بھی جام نور میں بحث ہونا چاہیے تاکہ صحیح اسلامی نظریہ سامنے آ سکے-

''اظہار خیالات'' کے کالم میں ڈاکٹر محبّ الحق صاحب کا مراسلہ قابل توجہ ہے، مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کے بے جا استعمال پر ہمیں موصوف کی رائے سے اتفاق ہے، حضرت مولانا بہاء المصطفیٰ صاحب کا مراسلہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں، یہ حقیقت ہے کہ مفتی مطیع الرحمٰن صاحب اس وقت ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کی صورت حال سے دوچار ہیں، جام نور کے قارئین کو خوشتر صاحب کے سوالات کے تفصیلی جواب کا شدت سے انتظار ہے-

اظہار خیالات میں پانچواں اور آخری مراسلہ جناب محمد راغب احمد ناز کا ہے، اس میں انہوں نے مفتی شمشاد حسین صاحب کی ایک تحریر پر کچھ سوالات اٹھائے ہیں، یہ سوالات واقعی بڑے اہم ہیں، مفتی صاحب نے تصویر دیکھنے کو متفقہ طور پر حرام لکھا تھا، اس پر ناز صاحب سوال کرتے ہیں کہ ''تصویر دیکھنے کی حرمت کس دلیل سے ثابت ہے وہ بھی ایسی حرمت جو بقول مفتی صاحب متفقہ اور مجمع علیہ ہو؟'' جناب ناز صاحب کی غالبًا یہ جام نور میں پہلی تحریر ہے مگر نپا تلا انداز بیان، سنجیدہ اسلوب اور معقولی طرز استدلال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صاحب علم بھی ہیں اور پختہ قلم کار بھی، اس تنقید برمحل پر ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں اور جناب مفتی صاحب قبلہ سے بھی جواب میں اسی قسم کے سنجیدہ لب ولہجہ کی توقع کرتے ہیں-

''قدسی کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' مولانا ملک الظفر سہسرامی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، آٹھ صفحات پر مشتمل یہ قیمتی مضمون مستقل کالم ''جہانِ ادب'' کے شایانِ شان ہے۔ آغاز میں دو صفحہ کی طویل تمہید ہے جو قدسی کی نعتیہ شاعری سے نہیں بلکہ نعتیہ شاعری کی تنقید سے متعلق ہے۔ یہ تمہید وقیع اور معلوماتی سہی مگر اتنی طویل ہوگئی ہے کہ بجائے خود ایک مضمون کی حیثیت رکھتی ہے اور ایک الگ عنوان کی متقاضی ہے، مولانا ملک الظفر صاحب نے اپنے مخصوص تنقیدی انداز میں قدسی کی نعتیہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہیں قدسی کے عشقِ رسول کو سراہا ہے، کہیں قدسی کی مہارتِ فن کی داد دی ہے، کہیں زبان و بیان پر ان کی قدرت کا اعتراف کیا ہے اور کہیں قدسی سے ہونے والی فنی اور لسانی لغزشوں کی اصلاح کی ہے، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''قدسی نے نعتیہ اشعار میں بڑی خوبصورتی اور فن کاری سے اردو محاوروں کا برجستہ استعمال بھی کیا ہے'' اس کی مثال میں اشعار نقل کر کے لکھتے ہیں ''مذکورہ بالا اشعار میں محاوروں کے خوبصورت استعمال نے قدسی کے فلکِ نعت کو ستاروں کی انجمن بنا دیا ہے'' یہاں ہمیں تھوڑا سا تأمل ہے کیونکہ مولانا سہسرامی نے محاورات پر قدسی کی مہارت دکھانے کے لیے جو تین اشعار پیش کیے ہیں ہماری ناقص رائے میں قدسی کی محاورات پر قدرت کیا ثابت ہوتی، ان سے تو الٹا یہ ثابت ہو رہا ہے کہ محاورات پر قدسی کی نظر گہری نہیں ہے، مثال کے طور پر پہلا شعر:

قدسی راحم بن کے آئے مصطفیٰ
سر سے پانی جب زیادہ ہوگیا

(اس سے قطع نظر کہ لفظ راحم کا استعمال اردو میں محلِ نظر ہے) پانی سر سے زیادہ ہونا کوئی محاورہ نہیں ہے بلکہ ''پانی سر سے اونچا ہونا'' محاورہ ہے، محاورہ کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر تو کی جا سکتی ہے مگر تبدیلی نہیں کی جا سکتی، مثلاً آپ ''دل بھر آیا'' کو ''جگر بھر آیا'' نہیں کر سکتے۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ ''گستاخِ مصطفیٰ ذرا ناخن لے ہوش کا'' اس پر عرض ہے کہ ''ہوش کے ناخن لینا'' محاورہ ہے، ''ہوش کا ناخن لینا'' محاورہ نہیں ہے۔

تیسرے شعر کا مصرعہ ثانی ''غم نے ساحل پہ سر کو پھوڑ دیا'' اس کو اگر قدسی کی جدت

پسندی کہا جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ جدیدیت اور جدت پسندی کے نام پر آج کل جس قسم کی تراکیب کو رواج دیا جارہا ہے یہ بھی انہی میں سے ایک مان لی جائے گی، مگر صاحب مضمون کی نظر میں یہ مصرعہ قدسی کی محاورات پر قدرت کا آئینہ دار ہے، جہاں تک اردو محاورات کی بات ہے تو عرض ہے کہ ساحل پر سر پھوڑا نہیں جاتا، بپھری ہوئی موجیں یا لہریں ساحل پر سر پٹکتی ہیں، پھوڑتی نہیں ہیں، سر پھوڑنے کے لیے تو سب سے مناسب جگہ سنگ در یار یا دیوار جاناں ہوا کرتی ہے۔

قدسی کا ایک مصرعہ ہے'' پھر التفات خلد کی حوروں کی دیکھنا'' مولانا ملک الظفر صاحب نے اس مصرعہ میں تکرار اضافت کے عیب کی نشاندہی کی ہے جو بالکل درست ہے۔ واقعی اس مصرعہ میں تکرار اضافت کے عیب سے اس کا لفظی حسن متاثر ہوا ہے۔ سہسرامی صاحب نے اس کی اصلاح یوں کی ہے'' پھر التفات خلد میں حوروں کی دیکھنا'' بلا شبہ اس اصلاح سے تکرار اضافت کا عیب دور ہو گیا۔ مگر ایک عیب جو پہلے بھی تھا اور اب بھی باقی ہے وہ یہ کہ اگر یہ کمپوزنگ کی غلطی نہیں ہے تو مصرعہ میں التفات کو مونث استعمال کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اردو میں '' التفات'' مذکر استعمال ہوتا ہے۔

تربیت گاہ لوح وقلم میں مولانا محمد خالد کمال ضیائی کا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی ،موصوف الجامعۃ الاشرفیہ میں جماعت سابعہ کے طالب علم ہیں انہوں نے مضمون محنت سے لکھا ہے ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ عزیز موصوف سے ہم صرف اتنا کہنا چاہیں گے کہ حوالہ دیتے وقت کسی بھی شخصیت کے تمام القاب وخطابات اور عہدوں اور ڈگریوں کا ذکر ضروری نہیں ہے، اس سے عبارت کا تسلسل اور روانی متاثر ہوتی ہے۔

دینی سرگرمیوں کے کالم میں فقہی سیمینار بورڈ کے چھٹے فقہی سیمینار کی رپورٹ شائع کی گئی ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ یہ فقہی سیمینار بورڈ کب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے، اس کے اغراض ومقاصد کیا ہیں؟ اور آخر اسباب ستہ میں سے وہ کون سا سبب ہے جس کے آگے مجبور ہو کر (اشرفیہ میں مجلس شرعی کی موجودگی اور اس کی اطمینان بخش کارکردگی کے باوجود) بعض حضرات کو ایک نئے فقہی بورڈ کی ضرورت و حاجت محسوس ہوئی؟ یہاں ہم خوشتر

صاحب کے ایک اداراتی نوٹ سے ایک مختصر اقتباس نقل کرنا چاہتے ہیں ''مذہبی سطح پر عقائد و نظریات میں یگانگت کے باوجود شرعی مسائل کی عقدہ کشائی کے لیے کہیں ہم شرعی بورڈ بنا رہے ہیں، کہیں مجلس تو کہیں کونسل، جو وقتاً فوقتاً چند شرعی سوالات تیار کر کے اپنے اپنے منظور نظر مفتیان کرام کو ایک جگہ مدعو کر کے ان سے آراء لیتے ہیں، ہمارے سرکردہ مفتیان کرام کو ملکی پیمانے پر شاید ہی یہ موقع نصیب ہوا ہو کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر عقائد کی طرح ملی، شرعی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے اپنے اتحاد کا مظاہرہ کریں۔''

یہ واقعی ہماری جماعت کا ایک المیہ ہے، پہلے ہمارے یہاں مدرسوں کے نام مدرسہ یا دارالعلوم پر ہوا کرتے تھے، کسی نے اپنے مدرسہ کا نام جامعہ رکھ لیا تو آناً فاناً ہندوستان کے طول و عرض میں سیکڑوں جامعات اور مجوزہ یونیورسٹیاں معرض وجود میں آ گئیں، کہیں سے تربیت افتاء کا نعرہ لگایا گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار مدرسوں میں ''تربیت افتاء'' اور ''تخصص فی الافتاء'' کے شعبے قائم ہو گئے۔ کسی نے جماعت میں عربی ادب کے فقدان کی دہائی دی تو ہم نے فوراً ہر مدرسہ میں ایک شیخ الادب کا تقرر کر ڈالا، اب جب کہ فقہی بورڈوں اور شرعی کاؤنسلوں کے قیام کا آغاز ہو ہی گیا ہے تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اب ہر دوسرے تیسرے مدرسہ میں فقہی بورڈ قائم ہوتے دیر نہیں لگے گی۔

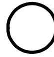
دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ ان سیمیناروں میں ایسے مسائل پر بحث کی جا رہی ہے جن میں اتنی زیادہ بحث و تمحیص کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے، مثلاً گل منجن سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ بم کے ذریعہ مچھلیوں کا شکار کرنا کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کے جوابات تو آپ کسی بھی ذمہ دار دارالافتاء سے معلوم کر سکتے ہیں، ہمارے خیال میں یہ اور اس قسم کے سوالات اتنے پیچیدہ ہیں ہی نہیں کہ ان کے حل کے لیے ایک فقہی بورڈ کی تشکیل کرنا پڑے۔

منظومات کے کالم میں جناب نسیم شاہجہانپوری کی ایک مرصع غزل پڑھنے کو ملی جو روایتی اردو شاعری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے، ڈاکٹر محبوب راہی صاحب کا خمسہ بھی پسند آیا۔ البتہ آخری بند قابل غور ہے ''لاشوں کا دشت'' اور ''خون میں لتھڑا ہوا دامان کربلا'' یہ

جدید تراکیب ہیں جو کم از کم ہمارے شعری ذوق پر تو گراں گزر رہی ہیں۔ اسی طرح خاک و خون میں لاشہ تڑپتا ہے یہ تو سنا تھا مگر خاک وخون میں لاشہ ڈوب بھی جاتا ہے، یہ ترکیب پہلی بار دیکھنے کو ملی۔ جام نور میں کمپوزنگ کی غلطیاں یوں بھی کم ہوتی ہیں، اس شمارے میں بھی بہت کم دیکھنے میں آئیں اور جہاں ہیں بھی تو وہ اتنی معمولی ہیں کہ ان سے عبارت کے معنی اور مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔



مئی ۲۰۰۵ء



اپریل کا جامِ نور مطالعہ کی میز پر تو ضرور ہے مگر میز کی زینت نہیں ہے، کسی تکنیکی خامی کی وجہ سے سرِ ورق میں وہ کشش نہیں ہے جو جامِ نور کا امتیاز ہے، کاغذ کے انتخاب میں بھی کچھ کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہے، بہرحال ہم اسکی ذمہ داری براہِ راست چیف اڈیٹر پر نہیں ڈالنا چاہتے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت یہ شمارہ آب وگل کے مراحل میں تھا اس وقت خوشتر صاحب مملکتِ خداداد پاکستان میں اپنے قدر دانوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے اپنے فکری اور قلمی جہاد کا خراج وصول کر رہے تھے......ع

جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

اداریہ حسبِ معمول فکر انگیز بھی ہے اور شمارہ کی جان بھی۔ رسائل وجرائد کے سیلاب پر حقیقت پسندانہ تبصرہ وتجزیہ اس اداریہ میں ''بیت الغزل'' کی حیثیت رکھتا ہے البتہ ''مدارس میں داخلہ کا خروش'' ہماری ناقص رائے میں صرف ''برائے وزنِ شعر'' ہے۔ اداریہ میں تمہید کے طور پر عرب کے پسماندہ ممالک میں لائن لگانے کی جو مثال دی گئی ہے وہ ممثل لہ سے لگاّ نہیں کھاتی، ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر عرب ممالک میں لوگ ہر کام لائن لگا کر کرتے ہیں تو یہ انکی فکری پسماندگی کی دلیل ہے یا ان کے نظم وضبط اور شائستگی کی علامت ہے؟ اگر یہ فکری پسماندگی ہے تو کیا ہمارے یہاں راشن کی دکانوں پر، ریل کی ٹکٹ خریدتے وقت، بسوں میں سوار ہوتے وقت، اور مدرسوں میں کھانا تقسیم ہوتے وقت کی ہاتھاپائی، دھکا مکی، دست وگریباں، اور طوفانِ بدتمیزی کو فکری بلندی کے خانہ میں رکھا جائیگا؟ دراصل خوشتر صاحب جو کہنا چاہتے ہیں اس کے لیے عام طور سے بھیڑوں اور چیونٹیوں کی مثال دی جاتی ہے۔ بھیڑوں کے غلہ میں اگر آگے والی بھیڑ ایک سمت کو مڑ جائے تو پیچھے آنے والی سب بھیڑیں بھی منزل اور نتائج کی پرواہ کیے بغیر اسی طرف کو چلنے لگتی ہیں، اسی طرح آگے والی چیونٹی جس طرف جاتی ہے پیچھے والی ساری چیونٹیاں بھی ''طابور'' لگا کر اسی کے پیچھے ہو

لیتی ہیں، تکلف برطرف ہماری جماعت کا حال اس سے کچھ مختلف نہیں ہے- اداریہ کا لب و لہجہ ناقدانہ تو ہوتا ہی ہے مگر اس مرتبہ کچھ جارحانہ بھی ہے، یہ دراصل اس درد کی غمازی کرتا ہے جو جماعت کے لیے خوشتر صاحب اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں، تاہم ان سے اتنا ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ ؎

ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

سیاست میں علما کی شرکت پر مولانا ذیشان مصباحی نے اچھی کوشش کی ہے، سیاست بازی اور سیاست دانی کی تقسیم حقیقت کی عکاسی ہے، مگر اس جملہ پر ہماری نظر ٹھہر گئی کہ ''فاروقِ اعظم ایک زبردست سیاس تھے'' اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے تو ہم اس کا معنی سمجھنے سے قاصر ہیں. ماہرِ سیاسیات یا سیاست داں کے معنی میں لفظِ سیاس کا استعمال اردو ، فارسی، عربی کسی زبان میں ہماری نظر سے نہیں گزرا-

تحریری مباحثہ میں جناب تنویر ارشد صاحب کی تحریر ہمیں پسند آئی، باقی حضرات نے بھی اچھا لکھا ہے، البتہ جناب ثمرالہدیٰ اور جناب صدرالاسلام مصباحی صاحب نے غیر ضروری طور پر اردو میں انگریزی کے الفاظ استعمال کر کے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اب مدرسہ کے نہیں بلکہ یونیورسٹی کے طالبِ علم ہیں، اردو میں بے محل اور برمحل انگریزی الفاظ کا استعمال ایک فیشن ہے جس کو روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت سمجھا جاتا ہے، لہٰذا ہم اس کی مخالفت کر کے اپنے اوپر تنگ نظری اور فکری پسماندگی کی پھبتی کسوانے کو تیار نہیں ہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ اس کی کچھ حدود ہونا چاہیے مثلاً وہ جدید اصطلاحات جن کا متبادل اردو میں نہیں ہے ان الفاظ کو اگر انگریزی میں لکھ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، جیسے ثمرالہدیٰ صاحب نے ایک جگہ knowledge update لکھا ہے، اس کے استعمال میں ہمیں کوئی حرج نظر نہیں آتا، کیوں کہ اس معنی کی ادائیگی کے لیے کوئی فصیح اردو لفظ کم از کم ہماری معلومات میں تو نہیں ہے، اس کے برخلاف تعظیم کو Respect مقصد کو Target حقیقی زندگی کو Real life شہری کو Citizen اور

مثبت کو Positive لکھنے کی کوئی معقول وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی، سوائے اس کے کہ قارئین کو اپنے انگریزی داں ہونے کا احساس دلایا گیا ہے۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کا انٹرویو پسند آیا، پیرزادہ صاحب کا نام جامِ نور کے قارئین کے لیے کوئی اجنبی نہیں ہے، موصوف نے حیاتِ اعلیٰ حضرت کی اشاعت پر بھی اظہارِ خیال فرمایا ہے، اس سے قبل مفتی مطیع الرحمٰن صاحب نے اپنی مرتّبہ ''حیاتِ اعلیٰ'' حضرت کے مقدمہ میں ''گفتنی'' کے عنوان سے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، اس کے بعد مولانا ملک الظفر سہسرامی نے جامِ نور میں اس پر طویل تبصرہ فرمایا، پھر ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی نے اپنے انٹرویو میں اس قضیہ کو ایک نیا موڑ دیا، اور اب پیرزادہ صاحب کا بیان سامنے آیا ہے، ہماری ناقص رائے میں اس سے پہلے کہ یہ معاملہ زلفِ جاناں کی طرح دراز اور شبِ ہجر کی طرح طوالت اختیار کر جائے اور آپس میں سوئے ظنی و بدگمانی کا پیش خیمہ ثابت ہو معاملہ کے تمام ذمہ دار فریقوں کو چاہیے کہ ایک جگہ بیٹھ کر یا سنجیدہ خط وکتابت کے ذریعہ افہام و تفہیم کر لیں تا کہ اگر واقعی کوئی جلد شائع ہونے سے رہ گئی ہو تو اس کی اشاعت کا سامان کیا جا سکے اور اگر گزشتہ ایڈیشنوں میں واقعی کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس کو درست کیا جا سکے۔

اس شمارہ کا خاص مضمون ''کلامِ امام اور ہماری سخن فہمی'' ہے، مضمون پر کچھ عرض کرنے سے پہلے ہم مضمون نگار کی خدمت میں یہ شعر نذر کرنا چاہتے ہیں ۔

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

محترم شرر مصباحی صاحب نے ہم جیسے بے شمار عقیدت مندوں اور قدردانوں کو ایک زمانے تک تشنہ کام رکھا اور جامِ نور کے قارئین کو اپنی گراں قدر تحقیقات سے استفادہ کرنے کے ان کے جائز حق سے محروم کیے رہے، ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ موصوف نے مہرِ سکوت توڑ کر میدان میں قدم رکھا بھی تو اس شان سے کہ ''رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے'' ''فنِ شاعری اور حسان الہند'' پر شرر صاحب نے جو تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ ماہرِ فن کی حیثیت سے انہی کا حصہ ہے اور ان کو زیب بھی دیتی ہے، شرر صاحب کو

اس کتاب کے سرِ ورق پر بھی تبصرہ کرنا چاہیے تھا جس میں مولانا ہمدانی صاحب کے میزانِ عقیدت کے ایک پلہ پر ''حدائقِ بخشش'' ہے تو دوسرے پلہ پر اردو کے تمام ''نام نہاد صفِ اول کے شعرا'' کے دواوین، کیا یہ سرِ ورق کسی صحت مند فکری رویہ کی عکاسی کرتا ہے؟؟ بہر حال ہمیں اس مضمون کی آئندہ قسطوں کا شدت سے انتظار ہے اور دیکھنا ہے کہ کلامِ امام سے متعلق ہماری سخن فہمیوں کا اونٹ آخر کس کروٹ بیٹھتا ہے، ہاں زیرِ نظر مضمون کی اس عبارت پر ہماری نگاہیں رک گئیں کہ ''مارہرہ مطہرہ کے نظمی صاحب سے میں پہلے سے واقف نہیں تھا ''فنِ شاعری اور حسان الہند'' کی تقریظ ہی علمی تعارف کا ذریعہ بنی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے صاحبِ سجادہ ہیں''.ہم شرر صاحب کے بارے میں لاکھ عقیدت اور حسنِ ظن سے کام لیں مگر اس تجاہلِ عارفانہ کی کوئی معقول توجیہ تلاش کرنے یا اس کے اصل محرک تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں، اب حضرت نظمی میاں صاحب قبلہ ایسے گمنام اور گوشہ نشین بھی نہیں ہیں کہ شرر صاحب جیسا وسیع الاطلاع شخص نہ صرف یہ کہ ان کی علمی حیثیت اور سجادگی بلکہ ان کی شخصیت ہی سے ناواقف ہو......ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

''فاضلِ بریلوی اور خانقاہی مراسم'' ایک طویل مضمون ہے، جس کی دوسری (اور شاید آخری) قسط اس شمارہ میں ہے، ڈاکٹر نوشاد چشتی صاحب نے ''رضویات'' کے ایک اہم گوشہ پر قلم اٹھایا ہے، اور پہلی قسط میں موضوع سے پورا انصاف کیا ہے، جس میں تحقیقی و علمی اسلوب کے ساتھ ساتھ لب ولہجہ کی سنجیدگی اور متانت کا بھی خاص خیال رکھا ہے، مگر پتا نہیں کیوں دوسری قسط میں وہ تحقیقی اسلوب اور علمی منہج سے دور جا پڑے اور کسی ''معروف قاری صاحب'' کے متعلق ''عجیب وغریب حقائق کا انکشاف'' کرتے ہوئے ان کے ''بعض رازہائے دروں'' سے پردہ اٹھانے میں مصروف ہو گئے، اس کے لیے انھوں نے جامِ نور کے تین قیمتی صفحات کا استعمال کیا ہے، یہ ''عجیب وغریب حقائق'' نہ ان کے موضوع سے کوئی خاص واسطہ رکھتے ہیں اور نہ ہی جامِ نور کے مزاج ومعیار پر پورے اترتے ہیں، اسی طرح

انہوں نے مفتی اعظم کے خلفاء کی جو بحث چھیڑی ہے وہ بھی حبِ علی میں کم، بغضِ معاویہ میں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ پہلی قسط میں موصوف نے ایک جگہ ''فاضلِ بریلوی مرحوم'' تحریر فرمایا ہے، کسی وفات یافتہ شخص کو ''مرحوم'' لکھنا کوئی بری بات نہیں ہے، مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ

''گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی''

الفاظ کے استعمال میں عرف کا بڑا دخل ہوتا ہے، آج مذہبی اور روحانی اعتبار سے کسی عظیم شخصیت کو ''مرحوم'' لکھنا معنوی اعتبار سے کتنا ہی درست کیوں نہ ہو مگر عرف کے خلاف ہے اور ناپسندیدہ ہے، اور اگر کسی کی اہمیت کم کرنے کے لیے ہو تو قابلِ مذمت بھی ہے، ممکن ہے کہ چشتی صاحب یہ دلیل دیں کہ خود (ان کے نقل کردہ حوالہ میں) فاضلِ بریلوی نے شاہ رفیع الدین دہلوی کو ''مرحوم'' لکھا ہے، تو اگر میں نے فاضلِ بریلوی کو مرحوم لکھ دیا تو کون سا گناہ کر دیا؟؟ یہ دلیل بڑی کمزور ہے اس لیے کہ ہر زمانہ کا اپنا الگ عرف ہوتا ہے، ایک زمانہ میں بڑے سے بڑے علامہ کو مولوی لکھا اور بولا جاتا تھا، جیسے مولوی فضلِ حق خیرآبادی، مولوی عبدالحی فرنگی محلی وغیرہ مگر آج جماعتِ سادسہ یا سابعہ کے کسی طالبِ علم کو مولوی کہہ کر دعوتِ خطاب دیدی جائے تو وہ چراغ پا ہو جائیگا اور اس کو اپنی توہین تصور کریگا۔ اور پھر اس بات کو اس زاویہ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحب کے مقابلہ میں فاضلِ بریلوی کی جو علمی حیثیت تھی کیا فاضلِ بریلوی کے مقابلہ میں وہی علمی حیثیت مضمون نگار کی بھی ہے؟ ہم خوشتر صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ اس قسم کے غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دارانہ مضامین شائع کرنے میں احتیاط برتیں تاکہ جامِ نور کا ہدف، تشخص، اور معیار متاثر نہ ہو، ویسے ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے سفر کی وجہ سے خوشتر صاحب اس مضمون کو نہیں دیکھ سکے ہوں گے ورنہ شاید یہ مضمون موجودہ شکل میں شائع نہ ہوتا۔

حضرت سید مدنی میاں صاحب کی نعتِ پاک نے اس مرتبہ منظومات کے کالم کی زینت اور معیار دونوں میں اضافہ کیا ہے، حضرتِ موصوف جس اعلیٰ شعری ذوق کے مالک ہیں اس کی جلوہ گری ہر ہر مصرعہ میں ہے، پوری نعت ''شعر اور پاسِ شرع'' کے حسین

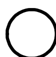
امتزاج کا خوبصورت مرقع ہے، معنوی اعتبار سے یہ شعر ہمیں بہت پسند آیا۔

اللہ اللہ رفعتِ اشکِ غمِ ہجرِ نبی
جونہی ٹپکا آنکھ سے تسبیح کا دانہ بنا

ہماری اپنی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے لہٰذا ہمیں نہیں معلوم کہ توالی اضافت کا کیا قاعدہ ہے؟ اب یہ تو شُرّر مصباحی صاحب ہی بتائیں گے کہ ایک مصرعہ میں لگا تار تین سے زیادہ اضافتیں جائز ہیں یا نہیں؟ اس شمارہ میں ہماری طرح قارئین نے بھی مولانا ملک الظفر سہسرامی اور مولانا اسید الحق بدایونی کی غیر موجودگی یقیناً محسوس کی ہوگی۔



جون ۲۰۰۵ء



مئی کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔سرورق ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے ڈیزائن کیا گیا ہے جو نہایت دیدہ زیب ہے۔ حسب سابق سرورق پر بعض مضامین کی سرخیاں بھی دی گئی ہیں جو سرورق کے حسن اور اسکی کشش میں اضافہ کررہی ہیں،البتہ ایک سرخی پر ہماری نظر رک گئی۔ ''کیا ورلڈ اسلامک مشن عالمی سطح پر دعوت وتبلیغ کا کام انجام دے رہی ہے؟'' مشن انگریزی لفظ ہے جو اردو میں مذکر استعمال ہوتا ہے،اس لیے سرخی یوں ہونا چاہیے تھی ''کام انجام دے رہا ہے'' اندرونی صفحات میں بھی اہل قلم نے اسکو مونث استعمال کیا ہے مگر بعض حضرات نے اس کے ساتھ تنظیم یا تحریک کا سابقہ یا لاحقہ لگا دیا ہے اس لیے جواز کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

اداریہ خوشتر صاحب کا سفرنامۂ پاکستان ہے جس کو ہم نے دلچسپی سے پڑھا اور لطف اٹھایا،سب سے پہلے تو ہم خوشتر صاحب کو اس کامیاب دورۂ پاکستان پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی علماے پاکستان کی بلند اخلاقی،مہمان نوازی،اور جذبۂ قدردانی کو سلام کرتے ہیں۔

اداریہ میں خوشتر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں دو اہم مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، پہلا مسئلہ تو ویڈیو، ٹی وی کے جواز وعدمِ جواز کا ہے،خوشتر صاحب نے یہاں جو بنیادی سوال اٹھایا ہے اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔جو چیز ہندستان میں ''حرام اشد حرام'' ہو اور اس کے مرتکب کو ترک مؤالات وترک معاملات جیسی سخت شرعی تعزیرات کا مستحق قرار دیا جائے وہی چیز اگر سرحد پار کی جائے تو نہ کسی تقدس مآب پیشانی پر سلوٹیں پڑیں اور نہ کوئی تقوی شعار جبیں شکن آلود ہو۔

اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

اس بات کو خوشتر صاحب نے جس انداز میں لکھا ہے اس میں گو کہ ترشی کی حد تک تلخی پیدا ہوگئی ہے مگر یہ ان کی مجبوری ہے کیونکہ بات حقیقت پر مبنی ہے اور حقیقت عموماً تلخ ہی ہوا کرتی ہے- دوسرا مسئلہ انہوں نے تقسیمِ ہند اور قیامِ مملکتِ خدا داد کا اٹھایا ہے، خوشتر صاحب نے تقسیم ہند کو ''گندی سیاست کا نتیجہ'' اور ''سیاسی بساط پر چالیں کھیلنے والوں کی بازی گری'' قرار دیا ہے. اس موضوع پر ہند و پاک میں گذشتہ نصف صدی میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ حقیقت کی تلاش مشکل ہوگئی ہے، تقسیم کے عوامل کو کوئی خالص مذہبی قرار دیتا ہے، تو کوئی خالص سیاسی، کچھ لوگ اس کو نیم مذہبی، نیم سیاسی تحریک بتاتے ہیں، تقسیم سے قبل کے حالات کا اگر منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب، سیاست، اور مستقبل کا خوف یہ تینوں عوامل ایک ناگزیر مثلث کی شکل اختیار کر گئے تھے. جس کے تینوں اضلاع باہم کچھ ایسے پیوست تھے کہ انکو اقلیدس کے خطوط پر بھی الگ کرنا ناممکن تھا، آج یہ کہنا آسان ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ہوجاتا اور یہ نہ ہوتا تو ایسا ہوتا مگر جو کچھ ہوا اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس حقیقت سے کوئی آنکھیں نہیں چرا سکتا، خوشتر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہر حال کسی حد تک حقیقت ہے مگر پھر بھی تصویر کا صرف ایک رخ ہے، اگر یہاں اجمالاً ہی سہی تھوڑی سی روشنی ہمارے پاکستانی احباب کے جذبات واحساسات پر بھی ڈال دی گئی ہوتی کہ خود وہ لوگ تقسیم کو کس انداز میں دیکھتے ہیں، اور ان کے خیال میں یہ تقسیم ان کے حق میں کتنی مضر یا مفید ثابت ہوئی ہے تو کسی کو تحریر میں یک قطبیت اور عدم توازن کا شکوہ بھی نہ ہوتا اور صحافتی غیر جانب داری کا حق بھی ادا ہو جاتا-

اداریہ میں بعض جگہ کمپوزنگ کی خامیاں رہ گئی ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے، آپکا اداریہ لوگ توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں بالخصوص ہمارے طلبہ کی ایک بڑی تعداد اداریہ پڑھ کر اپنی لسانی اور فکری سمتوں اور جہتوں کا تعین کرتی ہے، ان کے لیے آپ کے اداریہ کا ہر لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کی پروف ریڈنگ بہت توجہ سے کی جانی چاہئیے. لفظ ''پیرانا سالی'' الف سے نہیں بلکہ ''ہ'' سے پیرانہ سالی ہے-

اسی طرح ''خادموں کے آل'' نہیں بلکہ ''خادموں کی آل''. غالب کا ایک مشہور شعر

آپ نےنقل فرمایا ہےجس کا مصرعۂ اولی کمپوزنگ کی غلطی سے بحر سے خارج ہوگیا ہے،صحیح مصرعہ یوں ہے..خدایا جذبۂ دل کی ''مگر'' تاثیر الٹی ہے-

اداریہ میں ایک دو جگہ ہمیں زبان و بیان کے رخ سے بھی تأمل ہے،مثلاً ''آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں'' یہ ترکیب ہماری سمجھ میں نہیں آئی.''میں آبدیدہ ہوگیا''یا'' آنکھیں نم ہوگئیں'' ہونا چاہیے تھا.ہمارے مذہبی حلقوں میں لفظ'' کرم نوازی'' استعمال ہوتا ہے،اداریہ میں بھی ایک جگہ استعمال کیا گیا ہے،مگر ہماری ناقص رائے میں یہ ترکیب درست نہیں ہے،'' کرم فرمائی'' یا پھر'' بندہ نوازی'' یہ دونوں صحیح لفظ ہیں.لیکن کرم نوازی کو کسی بھی حال میں صحیح نہیں کہا جاسکتا،اداریہ میں ایک جگہ ہے''ہماری اضطرابیوں کا ازالہ فرمادیں'' یہ لفظ اضطرابیوں بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا،اسی طرح ''ایمان لاکر مشرف بہ اسلام ہوئے'' بھی محلِ نظر ہے. یا تو ''ایمان لائے'' ہوتا یا پھر ''مشرف بہ اسلام ہوئے'' ہوتا-

مولانا اسید الحق بدایونی کا مضمون ''حدیثِ افتراقِ امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں'' غالبًا ایک طویل مضمون ہے جس کی یہ پہلی قسط ہے،ایک فاضلِ ازہر سے جس قسم کے تحقیقی مضامین کی توقع کی جاسکتی ہے مولانا اس پر ہمیشہ پورے اترتے ہیں،حدیثِ افتراقِ امت کے آخری جز **کلها فی النار الا واحدة** پر انہوں نے تحقیقی بحث کرتے ہوئے اس کو کثرتِ طرق کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے،ہماری ناقص معلومات کی حد تک یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ مطلقاً ہر ضعیف الاسناد حدیث تعددِ طرق کی وجہ سے حسن قرار دے دی جائے،امام نووی نے حدیثِ پاک **من حفظ علی امتی اربعین حدیثاً** کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ تمام حفاظ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث کثرتِ طرق کے باوجود ضعیف ہے.اور پھر ضعیف کے حسن تک پہونچنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں.مثلاً ضعف اگر راوی کے ضبط میں ہوتو تعدد طرق سے وہ حدیث **حسن لذاته** ہوتی ہے.اور اگر ضعف راوی کے عدل میں ہوتو کثرتِ طرق سے ایسی حدیث **حسن لغیره** کہلاتی ہے.اور پھر حسن لغیرہ کو بہت سے حفاظ نے ضعیف ہی میں شمار کیا ہے،مولانا اگر ان گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد ضعیف کو حسن کے درجہ تک پہونچاتے تو تحقیق کا حق ادا ہوجاتا،مولانا نے متابعات وشواہد کا

ذکر کیا ہے،اس سے قطعِ نظر کہ اصطلاحی طور پر متابع اور شاہد میں فرق ہے اگر وہ ان متابعات وشواہد کا ذکر بھی کر دیتے تو ان کی بات مزید باوزن ہو جاتی۔

اس حدیثِ پاک کو پڑھتے وقت ذہن میں ایک خلش سی پیدا ہوتی ہے کہ جس امت کو قرآنِ کریم نے خیرِ امت،امتِ وسط،اور **شہداء علی الناس** کا منصب تفویض فرمایا ہو وہ تفریق وانتشار میں یہود ونصاری سے بھی گئی گذری ثابت ہو گی؟ یعنی یہود اے،نصاری ۷۲ اور یہ امت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائیگی؟ اس بات کو قرآنِ کریم کی اس آیت کی روشنی میں دیکھیں کہ اللہ تعالی نے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا ''ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے بغض وعداوت ڈال دی ہے'' (المائدہ ۶۴) اور بالکل یہی بات نصاری کے بارے میں فرمائی (المائدہ ۱۴) جبکہ امتِ اسلامیہ کے بارے میں نہ صرف یہ کہ قرآن نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی بلکہ جگہ جگہ انتشار وافتراق سے دور رہنے اور یہود ونصاری کی طرح فرقہ نہ ہونے کا حکم دیا ہے۔(آلِ عمران ۱۰۳،۱۰۵).دوسرے یہ کہ یہ بات بھی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اس امت کا صرف ایک فرقہ جنتی ہو گا باقی ۷۲ فرقے دوزخی ہونگے،حالانکہ صحیح احادیث کے مطابق نصف اہلِ جنت یا ثلث اہلِ جنت اسی امت سے ہونگے،فاضلِ مقالہ نگار اپنے وسیع مطالعہ کی روشنی میں اگر ان گوشوں پر بھی کچھ لکھیں تو ہم ان کے شکر گذار ہونگے۔

اس حدیث پر لکھنے والوں نے عموماً امتِ اسلامیہ کے ۷۲ فرقے تو شمار کروا دیئے ہیں مگر یہ بات بھی تو تحقیق طلب ہے کہ یہود ونصاری کے ۷۱ اور ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت ہے یا نہیں؟ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ خود یہود ونصاری کی کتب (وہ تحریف شدہ ہی سہی) میں اس افتراق وتفریق کا کوئی ذکر ہے یا نہیں؟ ممکن ہے مولانا نے مضمون کی آئندہ قسطوں میں اس پہلو پر کچھ لکھا ہو.اور اگر نہیں لکھا تو ہم گذارش کرینگے کہ وہ اس پر ضرور کچھ لکھیں ورنہ تحقیقی نقطۂ نظر سے مضمون ادھورا رہیگا۔

مولانا ذیشان احمد مصباحی عموماً سلگتے ہوئے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں،عورت کی امامت پر انہوں نے اچھا مضمون لکھا ہے البتہ ''نماز پڑھایا'' اور ''دل کا

بھڑاس'' ہماری سمجھ میں نھیں آیا.نماز اور بھڑاس دونوں مؤنث ہیں اس لیے ''نماز پڑھائی'' اور'' دل کی بھڑاس'' ہونا چاہیئے-مولانا ملک الظفر سہسرامی نے اظہارِ خیالات کے تحت اپریل کے شمارہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے.جس میں اِس غریب راقم الحروف پر بھی کرم فرمایا ہے، اِس کرم فرمائی پر ہم ان کے شکر گذار ہیں.اور بصد ادب واحترام یہ شعر ان کی نذر کرنا چاہتے ہیں ؎

زمانہ ہم سے جو برہم دکھائی دیتا ہے
ہماری بات میں کچھ دم دکھائی دیتا ہے

اسی کالم میں راغب احمد ناز صاحب نے مفتی شمشاد صاحب بدایونی کے جواب پر سنجیدہ مگر فاضلانہ تنقید فرمائی ہے، یہ پختہ قلم، یہ علمی گہرائی،اور یہ تنقید کا معقولی انداز، پتا نہیں کیوں یہ ہمیں کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاذِ ازل گفت ہماں می گوئم

تربیت گاہِ لوح وقلم میں مولوی عطاء المعین اشرفی نے ''ائمہ اربعہ کی تقلید ضروری کیوں؟'' کے عنوان سے اچھی کوشش کی ہے، وہ ہماری جانب سے حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں،عزیز موصوف نے قاضی ثناءاللہ پانی پتی کی تفسیرِ مظہری کا حوالہ یہ کہہ کر دیا ہے کہ قاضی صاحب غیر مقلدین کے معتمد علیہ ہیں، یہاں اکثر لوگوں کو نام کی یکسانیت کی وجہ سے دھوکہ ہوتا ہے،قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م۱۲۲۵ھ)سنی ،حنفی،اور صوفی ہیں،آپ کی تفسیر دس جلدوں میں تفسیرِ مظہری کے نام سے مشہور ہے،غیر مقلدین کے معتمد علیہ آپ نہیں بلکہ آپ کے ہم نام قاضی ثناءاللہ امرتسری (م۱۹۴۸ء) ہیں،موصوف خود کٹر غیر مقلد تھے.امرتسر سے انہوں نے ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' جاری کیا تھا جس میں بڑی شد و مد سے اہل سنت اور احناف کا رد کیا کرتے تھے،ان کی تفسیر اردو میں تفسیرِ ثنائی کے نام سے مشہور ہے-

منظومات کے کالم میں بیکل صاحب کی مرصع نعتِ پاک پڑھنے کو ملی جس کا یہ شعر ہمیں بہت پسند آیا ؎

ایک ادنی سا غلامِ شۂ کونین ہوں میں
میرے اعزاز و تعارف کی یہ تفصیل ہوئی

بیکلؔ صاحب کے مقطع کا پہلا مصرعہ ''کردیا فکرِ مضامینِ ثنائے بیکل'' یا تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا یا پھر اس میں کمپوزنگ کی کوئی غلطی ہے۔

جناب عقیل گیاوی صاحب کی حمد بھی پسند آئی، البتہ زبان و بیان کے رخ سے ہمیں بعض جگہ کلام ہے، مثلاً

طوطے کو بولنے کا سلیقہ دیا ہے کون

''سلیقہ دیا ہے'' کے ساتھ ''کون'' بے جوڑ ہے، یہ دراصل ''کس نے'' کا محل تھا. یعنی سلیقہ دیا ہے کس نے، اسی طرح ایک اور مصرعہ ؎

ملحد کو کیا خبر کہ سبھوں کا خدا ہے کون

''سبھوں'' متروک ہونے کی وجہ سے اب غیر فصیح ہے، یہاں سبھی ہونا چاہئے تھا، ایک اور مصرعہ ہے

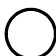
خوشبو بہ ہر مقام یہ بکھرا رہا ہے کون

اس سے قطعِ نظر کہ ''بہ ہر مقام'' بھی غور طلب ہے اردو میں بکھرانا خوشبو کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا، خوشبو بکھیرنا استعمال ہوتا ہے، ہاں البتہ زلف یا بالوں کے ساتھ بکھرانا استعمال ہوتا ہے، غالباً جگر کا مصرعہ ہے۔ ''بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا''

خطوط کے کالم میں مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب نے ہماری اپریل کی خامہ تلاشی کو سراہا ہے اس ذرہ نوازی پر ہم ان کے شکرگذار ہیں۔

❑❑❑

جولائی ۲۰۰۵ء



جون کا شمارہ پیش نظر ہے۔اس ماہ کا ٹائٹل نہایت دیدہ زیب،خوبصورت اور پرکشش ہے،اس کی تعریف میں کفایت شعاری سے کام لینا دیانت کے منافی ہوگا،گویا گزشتہ تین چار ماہ کا کفارہ ادا کردیا گیا ہے۔

اس بار کا اداریہ مختصر ضرور ہے مگر قابل مطالعہ ہے، یہ دراصل خوشتر صاحب کے ایک مباحثہ کی روداد ہے، جو مختلف مسالک کے نمائندوں کے مابین مسلم پرسنل لاء کے حوالہ سے ای۔ٹی۔وی اردو کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔مباحثہ میں خوشتر صاحب نے جماعت اہل سنت کی نمائندگی کرتے ہوئے جماعت کے موقف کو سنجیدہ اور علمی پیرایہ میں عالمی سطح پر واضح کیا۔(یاد رہے کہ مذکورہ چینل ہندستان کے علاوہ بھی بہت سے ممالک میں دیکھا جاتا ہے)اداریہ میں انہوں نے ایک اہم نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ ہم اہل سنت کو''بریلوی'' کہنا کہاں تک درست ہے؟ ہمارے خیال میں اس معاملہ کو اب تک عقیدتوں کے زاویہ سے دیکھا گیا ہے،اس پر حقیقت پسندی سے غور نہیں کیا گیا،اگر کسی نے اس پر زبان کھولنے کی جرأت کی بھی تو اس کی بات نقار خانہ میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک زمانہ میں لفظ''وہابی'' گالی کے طور پر استعمال ہوتا تھا مگر پھر ہلکے ہلکے ان لوگوں نے اس لفظ کو قبول کرلیا اور خود کو جماعت وہابیہ یا فرقہ وہابیہ کہنے اور لکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے،مگر ان کو جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ خود کو وہابی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جماعت شیخ ابن عبدالوہاب کی پیرو ہے اور گویا شیخ نجدی اس جماعت کے بانی ہیں۔اس بات کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام میں یہ ایک نیا فرقہ ہے جو گزشتہ دو تین صدیوں کی پیداوار ہے،اس بات کا احساس ہوتے ہی ان لوگوں نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی اور بڑی شدومد سے خود کو''سلفی'' یا''اہل حدیث'' اور اپنی جماعت کو''جماعت سلفیہ'' یا ''جماعت اہل حدیث'' کہنا اور لکھنا شروع کردیا۔اب چونکہ سلف سے وہ لوگ صحابہ کرام

کی جماعت مراد لیتے ہیں اس لیے اس نام سے انہوں نے یہ تأثر دینا چاہا کہ یہ کوئی نئی جماعت یا نیا فرقہ نہیں ہے، بلکہ یہ صحابہ کے نقش قدم پر چلنے والی جماعت ہے-اس بات کے پس منظر میں اب ہم لفظ ''بریلوی'' کا جائزہ لیتے ہیں-ابتداءً ہمارے مسلکی حریفوں نے ہمیں ''رضاخانی'' کہنا شروع کیا،اس لقب کو ہم نے پوری سختی سے رد کردیا،اس لیے یہ زیادہ نہیں چل سکا،.پھر اس کے بعد انہوں نے نہایت چالاکی سے ہماری عقیدتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ''بریلوی'' کہنا اور لکھنا شروع کر دیا اور امام احمد رضا کو فرقہ بریلویہ کے بانی کی حیثیت سے متعارف کروانے لگے، جوش عقیدت ومحبت میں ہم اس سازش کا پورا پورا شکار ہوگئے اور اس کے دوررس نتائج اور خطرناک عواقب کا ہمیں احساس تک نہ ہوا، اور ہم خود کو بریلوی کہنے پر اصرار کرنے لگے، بلکہ اگر کسی نے دبے الفاظ میں اس کی مخالفت کی تو الٹا ہم نے اس کی جماعتی وفاداریوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا-اب صورت حال یہ ہوگئی کہ ہم تو ''بریلوی'' کہلائے اور دیوبندی خود کو ''سنی'' کہہ کر متعارف کروانے لگے- دوسری طرف احسان الٰہی ظہیر کی کتاب ''ا لبریلویہ'' نے ایک فرقہ کی حیثیت سے ہمارا تعارف عالمی سطح پر کروادیا-عالم عرب کے وہ علما ومشائخ جو عقائد واعمال میں اسی فکر ومزاج کے حامل ہیں، جو ہماری پہچان ہے وہ بھی ہمارے سلسلہ میں بدگمان ہو گئے اور ہمیں ایک جدید فرقہ تصور کرنے لگے،خود کو بریلوی فرقہ کی صورت میں متعارف کروانے کا یہ نقصان تو عالمی سطح پر ہوا-ملکی اور جماعتی سطح پر اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ سنی خانقاہیں اور قدیم علمی خانوادے جن کی اپنی ایک روشن تاریخ اور زریں روایات رہی ہیں اور بدعقیدگی کے خلاف ان کے اکابر ومشائخ کی علمی اور عملی خدمات نا قابل فراموش ہیں وہ نہ صرف یہ کہ خود کو بریلوی کہلوانے پر آمادہ نہیں ہوئے، بلکہ اس لفظ کو سن کر بدکنے لگے-نتیجہ کے طور پر مسلکی اجتماعیت کا خواب بکھر کر رہ گیا-ادھر ہمارے کچھ احباب نے لفظ بریلوی پر اتنا اصرار کیا کہ اس کو جینے مرنے کا مسئلہ بنا لیا،اس شدت کے رد عمل میں یہ خانقاہیں اور خانوادے جماعتی دھارے سے کٹتے چلے گئے، یہ خلیج اتنی وسیع ہوگئی کہ جماعت متعدد خانوں میں تقسیم ہوگئی-

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہمارے اکابرین مثلاً حجۃ الاسلام، مفتی اعظم، صدرالشریعہ

اور صدر الا فاضل وغیرہ نے تحریر و تقریر میں خود کو کبھی بریلوی نہیں کہا، شاید اسی لیے جانشین مفتی اعظم حضرت ازہری میاں نے سعودی عرب میں اس بات کی سختی سے تردید کی تھی کہ ہندستان میں بریلوی نام کا کوئی فرقہ ہے اور آپ نے خود کو سنی اور حنفی کہنے پر اصرار کیا تھا- اب ضرورت اس بات کی ہے کہ عقیدتوں اور محبتوں کے بحر بے کراں سے نکل کر سنجیدگی اور حقیقت پسندی سے اس پورے معاملہ پر از سر نو غور و فکر کیا جائے اور جو بات بھی جماعت کے اتحاد اور روشن مستقبل کے حق میں بہتر ہو اس کو کشادہ قلبی سے قبول کر لیا جائے- اداریہ کے ایک جملہ پر ہماری نگاہیں شرم سے جھک گئیں- ''خواتین میں باغیانہ ذہن کی ولادت کے جذبہ نے انہیں دردزہ میں مبتلا کر رکھا ہے'' یہ جملہ ذوق سلیم پر بار ہے- اس قسم کے سطحی جملوں سے احتراز کرنا چاہیے تا کہ قلم کا وقار مجروح نہ ہو-

تحریری مباحثہ کا موضوع آج کے سلگتے ہوئے موضوعات میں سے ایک ہے- اگر چہ محترم ڈاکٹر امجد رضا امجد کے خیال میں ''تعلیم نسواں کے جواز و عدم جواز سے متعلق سوالات قائم کرنا کچھ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے'' مگر ہماری رائے میں یہ ایک ضروری مسئلہ ہے- کیونکہ عورت کے حقوق کو لے کر آزادی نسواں کے نام نہاد علم بردار اسلام پر طرح طرح سے کیچڑ اچھال رہے ہیں اور ہمارے کچھ نادان دوستوں کا رد عمل ان دشمنان اسلام کی توقعات اور خواہشات کے عین مطابق ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں صحیح اسلامی نظریہ کو واضح کیا جائے -تحریری مباحثہ میں مولانا منظر الاسلام ازہری کی تحریر ان کی روشن خیالی اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہے- ایک حدیث کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں ''اس کو طبرانی نے ضعیف طریقہ سے روایت کیا ہے'' یہاں ہم قارئین کی اطلاع کے لیے عرض کر دیں کہ اس حدیث کو طبرانی نے **المعجم الکبیر** (ج ۱۱ ص ۲۱۶) میں روایت کیا ہے- اس کے ضعف کی علت یہ ہے کہ اس میں ایک راوی **ابو علی الحسین بن قیس الرحبی** ہیں جو **حنش بن قیس** کے نام سے مشہور ہیں- ان کو امام ترمذی نے ضعیف کہا ہے (الترمذی ج ۱ ص ۳۵۶) امام ہیثمی نے متروک کہا ہے (مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲۰۵) اور ابن ابی حاتم نے منکر الحدیث کہا ہے (الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۳۵۲) یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ طبرانی کی اس

حدیث کو امام ابوداؤد نے سنن میں (۳۳۸/۴) ابن ابی شیبہ نے مصنف میں (۲۲۱/۵) اور ابو یعلی نے مسند میں (۱۴۷/۴) روایت کیا ہے- اور ان کی اسناد قابل اعتبار ہیں-

اظہار خیالات کے کالم میں سید سیف الدین اصدق چشتی صاحب کی تحریر اور اس پر ادارتی نوٹ دونوں ہمیں پسند آئے- سید صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں ''کبھی کبھی آپ کے قلم کے تیکھے تیور سے میں خوف زدہ بھی ہو جاتا ہوں'' اگر سید صاحب کو خوشتر صاحب کے اس ادارتی نوٹ کے ''تیکھے تیور'' کا گلہ ہو تو وہ بالکل حق بجانب ہونگے- سید صاحب نے میر کا ایک شعر نقل کیا ہے جس کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی وجہ سے دونوں مصرعوں کا وزن ساقط ہو گیا ہے- صحیح شعر یوں ہے ۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

گزشتہ کئی شماروں سے مفتی شمشاد حسین صاحب اور راغب احمد ناز صاحب کے درمیان تصویر کے جواز و عدم جواز کے موضوع پر علمی مذاکرہ چل رہا تھا- پچھلے شمارے میں راغب صاحب نے مفتی صاحب کی تحریر پر کچھ سوالات قائم کیے تھے، اب گیند مفتی صاحب کے پالے میں تھی مگر کسی وجہ سے مفتی صاحب نے ان سوالات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا- اب ان کی حمایت کا پرچم بلند کیے بدایوں کے کوئی عبدالرسول قادری صاحب نمودار ہوئے ہیں، جو خیر سے کسی دارالعلوم کے ناظم اعلی بھی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ جملوں کی تراش خراش اور الفاظ کی نشست و برخواست کو پرکھ کر اسلوب تحریر کو پہچاننے والی نگاہیں عام طور پر دھوکا نہیں کھاتیں- مگر پھر بھی ......ع

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پوچھیے اپنی جبیں سے

خوشتر صاحب نے ادارتی نوٹ میں اس تحریر پر اچھا تبصرہ کیا ہے اور شاید راغب ناز صاحب بھی اس پر کچھ لکھیں، مگر ہماری نظر میں تو اس تحریر میں کوئی نئی بات نہیں ہے، وہی سب باتیں جن پر راغب ناز صاحب سوالات قائم کر چکے ہیں، انہیں کو دوبارہ گھما پھرا کر پیش کر دیا

گیا ہے-عبدالرسول صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ" جب کوئی حکم جعل مرکب کے لیے ثابت ہوگا تو علل اربعہ بھی اس کے دائرۂ حکم میں ضرور آئینگے".یہ ایسی عجیب وغریب منطق ہے کہ اگر اس کو درست مان لیا جائے تو بات اتنی بگڑ جائے گی کہ بنائے نہیں بنے گی-مثلاً شراب ایک جعل مرکب ہے،انگور اس کی علت مادی ہے-اس جعل مرکب کے لیے جو احکام ثابت ہورہے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ نجس ہے،اس کا پینا،خریدنا،بیچنا سب حرام ہے اب آپ کی منطق کی رو سے وہ سارے احکام جو اس جعل مرکب (شراب) کے لیے ثابت کیے گئے ہیں ان کے دائرۂ حکم میں علل اربعہ ضرور آئیں گے-لہٰذا انگور (جعل مرکب کی علت مادی) نجس ،اس کا کھانا،خریدنا،بیچنا سب حرام-یہی نہیں اس منطق کی ضرب کہاں کہاں پڑے گی اس کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتے-مثلاً کائنات ایک جعل مرکب ہے ذات باری تعالی اس کی علت فاعلی ہے-اب کائنات کی جن جن اشیاء پر نجاست یا حرمت کا حکم لگایا جائے گا،کیا اس حکم کے دائرہ میں اس کی علل اربعہ بھی آئینگی؟ اگر ہاں تو خاکم بدہن کیا علت فاعلی (ذات باری) پر بھی آپ یہ حکم لگانے کی ہمت کرسکتے ہیں؟؟؟ قادری صاحب!بات صرف اتنی ہے کہ جعل مرکب کے تحقق کے لیے علل اربعہ کا تحقق ضروری ہے مگر یہ کہ جعل مرکب کے حکم اور علل اربعہ کے حکم میں کوئی تلازم ہے،یہ آپ کی خانہ ساز منطق ہے جو شاید آپ کے دارالعلوم میں پڑھائی جاتی ہو-"**الامور بمقاصدھا**" والی بات بھی بالکل پادر ہوا ہے-آج تک تو اس فقہی ضابطہ کا مطلب ہم نے یہ پڑھا ہے کہ مقصد حرام ہوگا تو شی بھی حرام ہوگی،مگر یہ پہلی بار پڑھا کہ شی حرام ہے اس لیے اس کا مقصد بھی حرام ہے-

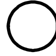
مولانا کوکب نورانی صاحب کا انٹرویو طوالت کے باوجود ہم نے دلچسپی سے پڑھا-زمانے کے بدلتے ہوئے حالات سے یکسر منہ موڑنے والے"فقیہان حرم" کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس انٹرویو کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور بدلتے ہوئے زمانہ کے جبری تقاضوں کے تحت دعوت وتبلیغ،اصلاح وارشاد اور مذہب ومسلک کے دفاع کے سلسلہ میں ٹی-وی کی ضرورت وافادیت پر از سر نو سنجیدگی سے غور کریں-

محترم شرر صاحب کا تحقیقی مضمون بالآخر اختتام پذیر ہوا اور ایک طویل عرصہ کے لیے

ذہن ودماغ پر اپنے اثرات چھوڑ گیا- ہم نے مئی کی خامہ تلاشی میں عرض کیا تھا کہ شررصاحب کو ہمدانی صاحب کی کتاب کے سرورق پر بھی تبصرہ کرنا چاہیے- چنانچہ مضمون کے آخر میں موصوف نے اس پر تبصرہ فرمایا ہے اور خوب فرمایا ہے- ایک جگہ لکھتے ہیں- ''اگر حدائق بخشش کے متوازی پلہ میں حضرت پیمی یا حضرت عشقی یا حضرت عینی'' الخ- اس عبارت سے ایک عام قاری کو یہ مغالطہ ہوسکتا ہے کہ حضرت پیمی اور حضرت عشقی دو الگ الگ شخصیات ہیں- اس لیے ہم وضاحت کردیں کہ دراصل یہ ایک ہی شخصیت کے دو تخلص ہیں- حضرت شاہ برکت اللہ مارہروی علیہ الرحمہ عربی فارسی میں عشقی اور ہندی میں پیمی تخلص فرماتے تھے- منظومات کے کالم میں محترم سید صبیح رحمانی کی ''نعت پاک'' بہت مرصع ہے- اس کو ہم نے نعت پاک اس لیے کہا کہ اس کی شہ سرخی میں بھی ''نعت پاک'' ہی لکھا ہے- ورنہ اس کے آٹھ اشعار میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جس کو نعت کا شعر کہا جائے- صبیح صاحب نے قوافی کا استعمال جس برجستگی اور خوبصورتی سے کیا ہے وہ ان کے قادرالکلام ہونے کی دلیل ہے- ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کی نعت بھی پسند آئی- مطلع میں انہوں نے گھڑی اور کھڑی کا قافیہ استعمال کیا ہے اور بعد کے اشعار میں پڑی، اڑی اور جڑی وغیرہ لائے ہیں. جب مطلع میں ''ڑ'' کے ساتھ ''ھ'' کا التزام کیا ہے تو باقی قوافی میں بھی اس کی رعایت ضروری تھی، یہ قافیہ کا عیب ہے اس سے بچنا چاہیے- مقطع کے مصرعۂ ثانی میں ''مواجہ'' بروزن ''مفاعل'' بھی قابل غور ہے- اس مرتبہ ''آپ نے کہا'' کا پورا کالم اِس غریب خامہ تلاش کی تعریف وتنقید کی نذر ہوگیا ہے- ہم شرر صاحب، سہسرامی صاحب، اور منظر الاسلام صاحب کے شکر گزار ہیں کہ یہ اہل علم ''خامہ تلاشی'' کو توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں- منظرالاسلام صاحب چونکہ ازہری ہونے کے ساتھ ساتھ ''کیلی فورنوی'' بھی ہیں اس لیے عربی کے علاوہ غالباً انگلش پر بھی انکی گہری نگاہ ہوگی- لہذا ہم ان سے یہ عرض کرنے کی جسارت نہیں کرسکتے کہ Knowledge کا اردو ترجمہ ''تعلیم'' نہیں بلکہ ''معلومات'' ہے- تعلیم کو تو Education کہتے ہیں-



اگست ۲۰۰۵ء



جولائی کا شمارہ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے، پانچ صفحات کے طویل اداریہ کا موازنہ اگر گذشتہ شماروں کے معرکۃ الآرا اداریوں سے نہ کیا جائے تو پھر یہ اداریہ بہت خوب ہے، یہ اداریہ اس بات کا بھی احساس دلاتا ہے کہ خوشتر صاحب جماعتی، مسلکی، اور ملکی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی سطح کے ملی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، اسلام کے خلاف مغربی دنیا کے عزائم، عالم اسلام کے خلاف مغربی دنیا کے اہداف اور اسلامی دنیا کے خلاف امریکہ کا نونکاتی فارمولہ، یہ وہ عناوین ہیں جن کے تحت خوشتر صاحب نے مغرب اور مشرق یا بلفظ دگر عیسائیت بنام اسلام کی کشمکش پر اپنے مخصوص شگفتہ اور رواں دواں قلم سے گل کاری کی ہے، ساتھ ہی مغربی حملوں کے جواب میں ہمارے احتجاجی مظاہروں پر بھی سوالیہ نشان لگایا ہے- اداریہ معلوماتی ضرور ہے مگر بعض جگہ کمپوزنگ کی خامی اور بعض جگہ زبان و بیان کی لغزش ذوق سلیم پر بار ہے، ''استعماریت'' کوئی لفظ نہیں ہے یہاں استعمار ہونا چاہئے تھا، ''ثقافتی تغلب'' ہماری سمجھ میں نہیں آیا ''ثقافتی غلبہ'' ہونا چاہئے تھا، ''بے خطاترکش'' بھی ہمارے لیے نئی ترکیب ہے، اداریہ کا آخری جملہ ''یا پھر انہیں مذہبی، معاشی، سیاسی اور سماجی طور پر مستحکم کر کے مغرب کے ناپاک منصوبوں کا اتمام'' بھی قابل غور ہے، اتمام تکمیل کے معنی میں آتا ہے جملے کا پس منظر اس معنی کا متحمل نہیں ہے، خوشتر صاحب نے اتمام کو خاتمہ یا ناکامی کے معنی میں استعمال کیا ہے جو لغوی اعتبار سے درست نہیں ہے، بعض جگہ تذکیر و تانیث کی غلطیاں ہیں جن کا سہرا غالباً کمپوزر کے سر ہے-

مولانا اسید الحق بدایونی کے مضمون ''حدیث افتراق امت'' کی تیسری قسط زینت شمارہ ہے اور بقول مولانا ملک الظفر سہسرامی یہ مضمون علم حدیث کے تعلق سے ان کی وسعت علمی کا روشن اشاریہ بن کر سامنے آیا ہے، **کلها فی الجنة الا واحدة** کو صاحب **کشف الخفاء** نے امام شعرانی کی میزان کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس پر مولانا بدایونی فرماتے ہیں کہ تا دم

تحریرانکو یہ حدیث امام شعرانی کی میزان میں نہیں ملی اس پر عرض ہے کہ جب میزان میں یہ حدیث ہے ہی نہیں تو ملے گی کہاں سے؟ غالبًا یہاں امام العجلونی صاحب کشف الخفاء کو سہو ہوا ہے کیونکہ امام شعرانی نے یہ حدیث میزان میں نہیں بلکہ الیواقیت والجواہر میں نقل کی ہے۔

اس مرتبہ تحریری مباحثہ کے لیے بہت عمدہ عنوان منتخب کیا گیا ہے اور پھر اس پر اہل قلم کا حسن انتخاب مستزاد، مکرمی ڈاکٹر طلحہ رضوی برق صاحب نعت اور نعت گوشعرا پر لکھنے والے اولین قلم کاروں میں ہیں اور ان کی کتاب اردو میں تاریخ نعت کے حوالے سے بنیادی ماخذ کا درجہ اختیار کر چکی ہے، ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب خود صاحبِ طرز نعت گو شاعر ہیں اور مولانا ملک الظفر سہسرامی تاریخِ نعت اور تنقید نعت پر کئی گراں قدر مقالات سپرد قلم کر چکے ہیں، نعت پاک اور نعت گوشعرا کو نام نہاد علم برداران ادب نے مسلسل نظر انداز کیا ہے اس کے اسباب پر تینوں حضرات نے اچھی روشنی ڈالی ہے، برق صاحب کی تحریر مختصر مگر جامع ہے البتہ مولانا سہسرامی نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے ان کی تحریر طویل ہونے کے باوجود ہمیں پسند آئی۔

اس مرتبہ ''اظہار خیالات'' کا کالم کچھ زیادہ ہی صحت مند ہو گیا، دعوت اسلامی کی تائید اور تنقید پر مشتمل دو تحریروں کی بیک وقت اشاعت جام نور کی صحافتی غیر جانب داری کی دلیل ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ حضرت مولانا بہاء المصطفی صاحب نے حرمت تصویر کے قائلین کو ''ہوا میں لٹھ مارنے والا'' قرار دیا ہے، اس جملہ پر ہم ایک بے ساختہ قہقہ کو روکنے میں ناکام رہے، تصویر کے سلسلہ میں مولانا موصوف کی دو تین تحریریں اب تک شائع ہو چکی ہیں جو صرف تنقید و تبصرہ تک محدود ہیں، ہماری گذارش ہے کہ حضرت ''او گفت اور آنہا گفتند'' کا اسلوب اختیار کر کے ''سر دلبراں کو حدیث دیگراں'' نہ بنائیں بلکہ خود اپنا محققانہ کردار ادا کریں اور اپنے خداداد تفقہ، باریک بینی اور وسعت علمی کو بروئے کار لاتے ہوئے اس سلسلہ میں تحقیقی مضمون لکھ کر اپنا موقف واضح فرمائیں۔

گذشتہ دو شماروں سے مولانا منظر الاسلام ازہری سے ہماری نوک جھونک ہوتی آ رہی ہے، اس شمارے میں بھی انہوں نے ہمارے ایک ''مشورہ'' کو تنقید قرار دیکر اس پر خامہ

فرسائی فرمائی ہے، ہم ان کی اس تحریر کا کشادہ قلبی سے خیر مقدم کرتے ہیں، (بقول مولانا ازہری) وہ ہماری تنقید دیکھ کر ''سکتہ'' میں پڑ گئے اور غالباً اسی ''سکتے'' کے عالم میں انہوں نے جوابِ تنقید کے لیے قلم اٹھا لیا، ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ موصوف نے ہم پر جو تنقید کی ہے خود اس کا جواب بھی اپنی اسی تحریر میں رقم فرما دیا ہے، ہم اس کشمکش میں ہیں کہ یہ تحریر ہمارے رد میں ہے یا ہماری تائید میں؟ ہم نے مئی کی خامہ تلاشی میں عرض کیا تھا کہ ''یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ مطلقاً ہر ضعیف الاسناد حدیث تعدد طرق سے حسن قرار دے دی جائے'' ہم اپنے اس بیان پر آج بھی قائم ہیں اور اس کے ثبوت کے لیے اپنی طرف سے کوئی دلیل لانے کی بجائے منظر صاحب کی مذکورہ تحریر کو ہی پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں، منظر صاحب نے ضعیف کی دو قسمیں کی ہیں، اول ضعیف ضعفِ خفیف، دوم ضعیف ضعف شدید، پھر فرماتے ہیں ''اسی اول قسم کے بارے میں مطلقاً یہ قاعدہ ہے کہ تعدد طرق سے حدیث ضعیف حسن ہو جاتی ہے'' یہ بات ہمیں بھی تسلیم ہے، دوسری قسم یعنی ضعیف ضعف شدید کے بارے میں منظر صاحب نے فرمایا ہے کہ ''یہ حدیث کثرت طرق کے باوجود حسن کے درجہ کو نہیں پہونچ سکے گی'' یہ بات بھی بالکل درست ہے، اسی لیے ہم نے عرض کیا تھا ''مطلقاً ہر ضعیف الاسناد حدیث، کثرت طرق سے حسن نہیں ہو جاتی'' کیوں کہ اہل علم جانتے ہیں کہ ضعیف کے متعدد درجات و مراتب ہیں ان میں بعض ضعیف احادیث تعدد طرق سے حسن ہو جاتی ہیں اور بعض نہیں ہوتیں، ہماری اس بات کو منظر صاحب نے ہم سے بہتر انداز میں واضح کر دیا، دراصل ان کو مغالطہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے ''سکتے'' میں پڑنے کی وجہ سے ہمارے جملے میں ''مطلقاً'' اور ''ہر'' کو نظر انداز کر دیا، انہوں نے امام سخاوی کی ''فتح المغیث'' اور ابن صلاح کی ''علوم الحدیث'' کا حوالہ دیا ہے، ہماری گذارش ہے کہ وہ فتح المغیث صفحہ ۸۲، ۸۳ (مطبوعہ: دار الامام الطبری ۱۴۱۲ھ) اور علوم الحدیث لابن صلاح صفحہ ۳۰، ۳۱ (المکتبۃ العلمیہ مدینہ منورہ ۱۳۸۶ھ) کا مطالعہ فرمائیں کیوں کہ زیر بحث سطور لکھتے وقت ان کتابوں کے مذکورہ مقامات ہمارے پیش نظر تھے، ''من حفظ علی امتـــــی'' پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی عجلت میں لکھا گیا معلوم ہوتا ہے، امام نووی نے شرح

اربعین میں اس حدیث کے متعدد الفاظ اور طرق ذکر کر کے فرمایا ہے "**اتفق الحفاظ علی انه حدیث ضعیف و ان کثرت طرقه**" یہ درست ہے کہ امام سیوطی نے اس حدیث کے مختلف طرق میں سے ایک کی تصحیح فرمائی ہے (الجامع الصغیر: ج۲ص۱۴۴) مگر جس طریقے کو امام سیوطی نے صحیح قرار دیا ہے اس کی سند میں عبدالرحمان بن معاویہ ہیں وہ حارث مولی ابن سباع سے روایت کرتے ہیں اور انہوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کی ہے، عبدالرحمان بن معاویہ کے بارے میں ابن معین نے فرمایا "**لا یحتج بحدیثه**" (**العلل المتناهیه**: ج۱ص۱۲۶) ویسے ہم عرض کر دیں کہ یہ حدیث ۱۳صحابہ کرام سے مروی ہے، جن میں حضرت علی، ابن مسعود، معاذ بن جبل، ابو الدرداء، ابوسعید خدری، ابو ھریرہ، ابوامامہ، ابن عباس، ابن عمر، ابن عمرو، جابر بن سمرہ، انس بن مالک اور حضرت بریدہ شامل ہیں (رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین) ان میں بعض صحابہ سے تو یہ حدیث تین تین چار چار طرق سے مروی ہے اس کے باوجود امام دارقطنی فرماتے ہیں **طرقه کلها ضعیفه ولیس بثابت** (کشف الخفاء ج۲ص۳۲۲) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں **جمعت طرقه فی جزء لیست فیها طریقةتسلم من علة قادحة** (مرجع سابق) امام البیہقی فرماتے ہیں **هذا متن مشهور فیما بین الناس ولیس له اسناد صحیح** (مرجع سابق) اس حدیث کے سلسلہ میں اگر منظر صاحب مزید تحقیق کے طالب ہوں تو محدث مغرب شیخ ابوالفیض الغماری کی کتاب **ارشاد المربعین الی طرق حدیث الاربعین** کا مطالعہ فرمائیں۔

سنبھل کر رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

مفتی محمد خان قادری صاحب اور مولانا منشا تابش قصوری صاحب کی گفتگو پسند آئی، قصوری صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں "حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا ہمیں وہی طریقہ اپنانا چاہیئے" ہمیں نہیں معلوم کہ فاضل بریلوی نے مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے ساتھ کیا سلوک

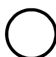
کیا تھا؟اس لیے کہ فاضل بریلوی کی ولادت (۱۲۷۲ھ) مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کی وفات (۱۲۲۵ھ) کے ۴۷ سال بعد ہوئی ہے، دراصل مولانا جس سلوک کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے ساتھ نہیں بلکہ حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی علیہ الرحمہ کے ساتھ کیا گیا تھا۔مفتی عبیدالرحمٰن رشیدی صاحب ہماری جماعت کی ایک ذی علم شخصیت کا نام ہے، نام ونمود سے دور گوشہ نشینی کی زندگی پسند فرماتے ہیں، بہت کم لکھتے ہیں مگر جب بھی لکھتے ہیں تو علمی حلقوں میں اپنے وجود کا احساس کروا دیتے ہیں، اس مرتبہ ''حضرت آسی غازی پوری کے ایک شعر کی تشریح'' کے عنوان سے آپ نے قلم اٹھایا ہے، یہ شعر روز اول سے بحث ومباحثہ کا موضوع بنا ہوا ہے، صدرالشریعہ سے لے کر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی تک بے شمار اہل علم نے اس کی تشریح و تفہیم کی کوششیں کی ہیں مگر ''ظاہر بیں'' حضرات کو آج تک اطمئنان نہ ہوسکا، افسوس ہم اپنا شمار بھی انہیں ''ظاہر بیں'' حضرات میں کرنے پر مجبور ہیں جو ''مشاہدۂ حق کی گفتگو'' بادۂ وساغر کے استعاروں کے باوجود سمجھنے سے قاصر ہیں، یہ ہماری فہم کا قصور ہے ویسے ہم مولانا اسلم بستوی کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ''یہ شعر عوامی نہیں بلکہ ایسا خواصی ہے کہ سرکار آسی کے درجہ کے اصحاب ہی اسے کما حقہ سمجھ سکتے ہیں'' (الکوثر شمارہ ۴ جلد ۱) تربیت گاہ لوح وقلم میں محمد ضیاء الرحمٰن علیمی نے اچھا مضمون لکھا ہے، جلوت وخلوت کو انہوں نے مذکر استعمال کیا ہے حالانکہ یہ دونوں مؤنث ہیں، لفظ ''تبیّں'' کا استعمال اب متروک ہے، ایک جگہ محاورہ غلط استعمال ہوگیا ہے، بیڑا کسی کے کاندھے پر نہیں ڈالا جاتا بلکہ اٹھایا جاتا ہے۔

پروفیسر ناز قادری، عرفی الہ آبادی اور سید منظر چشتی کی منظومات پسند آئیں، عرفی صاحب کی فکر اچھی ہے مگر ہر شعر مشکل اور گاڑھے فارسی الفاظ وتراکیب سے بوجھل ہے شعر کے حسن کے لیے صرف مشکل الفاظ لانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کا بے تکلف، برجستہ اور بر محل استعمال بھی لازمی ہے، ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں اور بڑے سلیقہ کے شعر کہتے ہیں، آپ نے ''**لم یات نظیرک**'' کا اچھا معارضہ کیا ہے تاہم نعت کے عربی

ٹکڑوں میں زبان کا وہ معیار قائم نہیں رہ سکا جو آپ کی اردو شاعری میں نظر آتا ہے، **حاسبنی حســابــاً من یســر** عربی محاورے کے اعتبار سے درست نہیں ہے، عربی میں حاسب کے ساتھ ''من'' استعمال نہیں ہوتا، **فــی القبر علی عبد انظر** میں تقدیم و تاخیر کے عیب سے قطع نظر (جس کو ''ضرورت شعری'' کہہ کر دور نہیں کیا جاسکتا) نظر کا صلہ ''علی'' ہماری نظر سے نہیں گذرا، **الحسرۃ** کے لیے ''**خلجت**'' کا استعمال بھی قابل غور ہے۔ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی نے خامہ تلاشی کو سراہا ہے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

❑❑❑

ستمبر ۲۰۰۵ء



اگست کا شمارہ ہاتھ میں ہے، سر ورق حسب روایت خوبصورت ہے، خامہ تلاشی کے علاوہ باقی سارے مشمولات معیاری ہیں، ''اسلامی نظریات کی عصری تفہیم و تبلیغ کی ضرورت'' کے عنوان سے ساڑھے چار صفحے کا اداریہ دعوت فکر و نظر دے رہا ہے، زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر دعوت و تبلیغ کے طریقوں اور وسائل کی تبدیلی وقت کا ایک جبری تقاضہ ہے، اس سے صرف نظر کرنا اور روایتی طریقوں کو حرز جاں بنائے رکھنا مومنانہ فراست کے منافی ہے، اس سلسلہ میں مدیر اعلی نے خانقاہوں اور مدارس اسلامیہ کے ارباب بست وکشاد اور دانشوران قوم کی خدمت میں کچھ تجاویز اور ان پر عمل کرنے کا طریقۂ کار تحریر کیا ہے، ان ہی خطوط پر خانقاہ قادریہ بدایوں کے زیر اہتمام بدایوں میں الازہر انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کے بارے میں تفصیلی رپورٹ ہم نے گذشتہ شمارے میں دیکھی تھی، خوشتر صاحب نے ایک ذیلی سرخی ''دشت امکاں میں تمنا کا پہلا قدم'' قائم کر کے الازہر انسٹی ٹیوٹ کا تعارف کرواتے ہوئے اس کو خانقاہی نظام میں آنے والے ایک انقلاب کا ''پیش خیمہ'' قرار دیا ہے، اب اگر خوشتر نورانی جیسا تنقیدی مزاج رکھنے والا دیدہ ور کسی اقدام سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کر رہا ہے تو یقیناً وہ بامقصد، نتیجہ خیز، اور دوررس اثرات کا حامل ہوگا - اداریہ میں ڈاکٹر اقبال کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے جس کے مصرعۂ ثانی میں ''دارو'' کی جگہ ''درماں'' اور ''سوچ'' کی جگہ ''ڈھونڈ'' ہو گیا ہے، صحیح مصرعہ یوں ہے...... ؏

دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

(ضرب کلیم)

''حدیث افتراق امت'' بالآخر اختتام پذیر ہوا اور اپنے پیچھے بہت سارے سوالات چھوڑ گیا اس کے کئی گوشوں پر گفتگو ہو سکتی ہے، مگر جگہ کی قلت کے پیش نظر فی الحال ہم کوئی

تبصرہ کرنے کی بجائے اہل علم کی آراء اوران کے ردعمل کا انتظار کررہے ہیں، گمراہ اور گمراہ گر کا حکم بتاتے ہوئے مولانا اسید الحق بدایونی نے اپنے جد امجد حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کی ایک عبارت نقل کی ہے، اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''اس حکم میں جو شدت اور سختی ہے اس سے قطع نظر یہاں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ یہ سارے احکام ''اولیٰ''، ''بہتر'' اور ''استحباب'' کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔'' اس تبصرہ کے بین السطور سے جو کچھ ظاہر ہورہا ہے وہ تو ہم نے سمجھ لیا مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب یہ سارے احکام اولیٰ، بہتر اور استحباب کے اردگرد گھوم رہے ہیں تو پھر آخر وہ کونسی ''سختی اور شدت'' ہے جس سے مضمون نگار نے ''قطع نظر'' کیا ہے، اولیٰ، بہتر اور استحباب یہ الفاظ حکم میں شدت کی نشاندہی کررہے ہیں یا نرمی کی؟

علامہ اختر شاہجہانپوری پر عبدالستار طاہر صاحب کا مضمون مستقل کالم ''شخصیات اسلام'' کی زینت ہے، مگر یہ مضمون لگ بھگ دو ڈھائی سال پرانا ہے، اس کا اندازہ ہم نے اس بات سے لگایا کہ مضمون کا آغاز ان الفاظ میں ہوا ہے'' آج اس شخص کو ہم سے جدا ہوئے نو سال کا عرصہ گذر چکا ہے'' آگے چل کر اسی مضمون سے معلوم ہوا کہ علامہ موصوف کی وفات ۱۹۹۳ میں ہوئی تھی، جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ یہ مضمون ۲۰۰۲ء یا ۲۰۰۳ء میں لکھا گیا ہے۔

''کیا مدارس میں اردو زبان وادب کو داخل نصاب کیا جانا چاہیے؟'' یہ اس مرتبہ تحریری مباحثہ کا عنوان ہے، مولانا یٰسین اختر مصباحی اور مولانا ملک الظفر سہسرامی نے اس موضوع پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مولانا مصباحی کی نظر میں'' درس نظامی کا نصاب ونظام تعلیم اس کا متحمل نہیں ہے کہ اردو وادب کے لیے اس میں گنجائش پیدا کی جائے۔'' جب کہ مولانا سہسرامی فرماتے ہیں کہ'' اردو زبان کو باقاعدہ داخل نصاب کر کے طلبہ کو اس زبان کے رموز ونکات سے آگاہ کرنا تقاضائے وقت کے عین مطابق ہے''۔مولانا مصباحی صاحب نے اختصار سے کام لیتے ہوئے بڑے نپے تلے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنی تحریر میں ''ایجاز مخل'' اور ''اطناب ممل'' دونوں کو راہ نہیں دی ہے، اس کے برخلاف مولانا

سہسرامی صاحب نے قدرے تفصیل سے کام لیا ہے،سہسرامی صاحب کی قلمی اور فکری صلاحیتوں کے ہم معترف ہیں اوران کی علمی ،فکری اورادبی تحریروں کوقدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ،مگراس مرتبہ انہوں نے تحریر کو کچھ زیادہ ہی طول دے دیا ہے، ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:''ایک مثال دیکھی جائے''علماؤں نے فرمایا''عالم کی جمع علما ہے اب علماؤں جمع الجمع قرار پائیگی؟لیکن اب ہماری جماعت کے پڑھے لکھے لوگوں کی تحریروں میں بھی اس طرح کی لغزش راہ پانے لگی ہے جنہیں دیکھ کر احساس شرمندگی سے سر جھک جاتا ہے''اس سے قطع نظر کہ''جنہیں'' کی بجائے''جسے''ہونا چاہیے تھا،مولانا کی اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ علماؤں لکھنا درست نہیں ہے بالکل اسی طرح جیسے''فتویٰ'' کی جمع ''فتاویٰ''ہے،اب ''فتاوؤں''جمع الجمع قرار پائے گی؟ ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں ہے،مگرایسی غلطیاں کبھی تو خود مضمون نگار سے ہوتی ہیں اور کبھی یہ کمپوزر کی مہربانی ہوتی ہے جومضمون نگار کے کھاتے ہی میں لکھ دی جاتی ہے،اب جام نور کے کمپوزر کی اس ستم ظریفی کا کیا کیا جائے کہ اس نے جون کے شمارے میں خود مولانا ملک الظفر سہسرامی کے مضمون میں ٦ جگہ فتاویٰ کو''فتاوؤں'' لکھ دیا ہے۔(شمارہ جون ص ۵۷،۵۸)

اس بار''اظہار خیالات'' کا کالم بہت اہم ہے،مولانا بدرالقادری بنام مولانا خوشتر نورانی کے مقدمہ میں مولانا یٰسین اختر مصباحی نے ثالثی کا کردارادا کرتے ہوئے فیصلہ کن تحریر سپرد قلم فرمائی ہے اور ساتھ ہی دعوت اسلامی کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی نے مولانا زبیر قادری کے شبہات کا ازالہ فرمایا ہے، یہ دونوں تحریریں اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہیں،مولانا یٰسین اختر صاحب ایک منجھے ہوئے قلم کار ہیں اورسلیقہ سے بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں،ان کے سامنے دشواری یہ تھی کہ ورلڈ اسلامک مشن ایک سنی تنظیم ہے اس کا دفاع ان کی جماعتی ذمہ داری تھی،مولانا بدرالقادری ان کے دیرینہ رفیق ہیں لہٰذا ان کا دل توڑنا بھی انہیں گوارا نہیں تھااور خوشتر نورانی ان کے پڑوسی ٹھہرے لہٰذا پڑوسی کے حقوق ادا کرتے ہوئے وہ ان سے بھی حسن سلوک کرنا چاہتے تھے،مولانا مصباحی نے ان تینوں تقاضوں کو اپنی ذہانت اور قلمی مہارت سے ایک ایسے مثلث کی شکل دیدی جس کے

تینوں اضلاع متساوی ہوں، لطف کی بات یہ ہے کہ انہیں جو کچھ کہنا تھا وہ بڑی خوبصورتی سے کہہ کر گذر گئے اور تینوں فریق الفاظ کے پیچ وخم میں الجھ کر اپنی اپنی جگہ مطمئن بھی ہو گئے. بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ اس سے قبل کہ آپس میں بدگمانیوں کی خلیج وسیع ہوتی یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا، ہم یہاں مولانا خوشتر نورانی کی بھی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے ''جھلسا دینے والے خط'' اور اس میں ''مہذب ومثقف الزامات ودشنام'' کے باوجود نہایت صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا ورنہ ان کو یہ حق پہونچتا تھا کہ وہ اپنے خلاف لگائے جانے والے ان بے بنیاد الزامات کا سخت سے سخت جواب دیتے ، اپنے ادارتی نوٹ میں انہوں نے جس سنجیدگی اور رواداری کا ثبوت دیا ہے اس پر ہم انہیں مبارک باد دیتے ہیں، البتہ مصباحی صاحب کے ''مقطع میں یہ سخن گسترانہ بات آپڑی'' کہ ''عوام سے سابقہ پڑنے کے بعد خوشتر کے تنقیدی مزاج میں تبدیلی آئی اور اب وہ جادۂ اعتدال پر گامزن ہوگئے ہیں'' پتانہیں خوشتر صاحب اس بات سے کہاں تک متفق ہیں؟ ہمارے خیال میں تبدیلی تو ضرور آئی ہے مگر اس کا سبب ''عوام سے سابقہ پڑنا'' نہیں ہے بلکہ ہم تو اس بات کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ شروع میں ''خفتگان خواب غفلت'' کو بیدار کرنے اور جماعت میں موجود فکری جمود وتعطل کو توڑنے کے لیے اسی قسم کے ناقدانہ اسلوب اور جارحانہ لب ولہجہ کی ضرورت تھی جو خوشتر صاحب نے اختیار کیا تھا اور اب دو سال کی مسلسل محنت کے نتیجہ میں جماعت کا جمود ٹوٹ رہا ہے، خود احتسابی کا عمل شروع ہوگیا ہے، احساس زیاں پیدا ہو چکا ہے اور خواب غفلت کے مزے لینے والے آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہورہے ہیں تو اب اس قسم کے تنقیدی لب ولہجہ کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی، لہٰذا جام نور کے اداریوں کا لب ولہجہ بھی تبدیل کردیا گیا-

مولانا نیاز احمد مصباحی کا مضمون ''قرآن مقدس کا اعجاز'' مستقل کالم تربیت گاہ لوح وقلم کے لیے منتخب کیا گیا ہے، نیاز صاحب غالباً المجمع الاسلامی میں تصنیف وتالیف کا دوسالہ کورس کررہے ہیں، انہوں نے محنت سے مضمون لکھا ہے وہ ہماری طرف سے حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں، یہاں ہم خوشتر صاحب کی توجہ اس طرف کرانا چاہتے ہیں کہ جام نور میں یوں

تو کتابت کی غلطیاں (دوسرے رسالوں کی بنسبت) کم ہوتی ہیں مگر کبھی کبھی ایسی غلطیاں ہوجاتی ہیں جو ناقابل معافی ہیں، مثلاً وہ غلطیاں جو آیات قرآنی کی کتابت میں ہوں، اب اسی مضمون کو ہی لے لیں اس میں ٦ آیات مبارکہ نقل کی گئی ہیں اور سب میں کچھ نہ کچھ سہو کتابت ہے، دوسری بات یہ کہ قرآن کی کتابت رسم عثمانی کے مطابق ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ رسم الخط توقیفی ہے اس کے برخلاف لکھنا جائز نہیں ہے، ان ٦ آیات میں سے تین میں رسم عثمانی کے خلاف کتابت ہوگئی ہے مثلاً صادقین، مفتریات، افترا ایسے نہیں بلکہ صٰدقین، مفتریٰت، افترٰئہ ایسے لکھا جائیگا، جناب نیاز احمد صاحب نے حضرت عمر فاروق کے ایمان لانے کا جو واقعہ نقل کیا ہے اس کے لیے انہوں نے اسد الغابہ اور الکامل فی التاریخ کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ''راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ'' سے لے کر ''اشھد ان محمد رسول الله'' تک ١٨ سطر کی پوری عبارت بہت معمولی تبدیلی کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی کی کتاب الفاروق کے صفحہ ٥٤، ٥٥ پر موجود ہے، خیر یہ ''توارد'' بھی ہوسکتا ہے مگر ہمیں اس روایت پر ایک دوسرے زاویہ سے کلام ہے، نیاز صاحب کی نقل کردہ روایت میں یہ ہے کہ حضرت فاروق کی بہن حضرت فاطمہ نے جو اجزاء ان کو دیئے تھے ان میں سورۂ حدید کی ابتدائی آیات تھیں، جن کو پڑھ کر حضرت عمر بے اختیار پکار اٹھے اشھد ان لا الٰه الا الله واشھد ان محمد رسول الله، یہ روایت ضعیف ہے اگرچہ اس کو ابن ابی شیبہ، ابن اثیر اور صاحب سیرت حلبیہ وغیرہ نے نقل کیا ہے، اس سلسلہ میں صحیح روایت یہ ہے جس کو ابن اسحاق، ابن سعد، ابویعلی، اور حاکم نے حضرت انس سے، البزار اور طبرانی نے اسلم مولیٰ عمر سے اور ابونعیم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ان اجزاء میں سورۂ طٰہ کی ابتدائی آیات تھیں جن کو پڑھ کر آپ نے فرمایا ما احسن ھٰذا الکلام یہ سن کر حضرت خباب (جو حضرت عمر کی آواز سن کر چھپ گئے تھے) سامنے آگئے اور فرمایا یا عمر و الله انی لارجو ان یکون الله تعالیٰ قد خصک بدعوۃ النبی الخ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا دلنی یا خباب علیٰ محمد حتیٰ آتیه فاسلم (دیکھئے: فتح الباری ٤٨/٧ البدایہ والنھایہ ٣٣/٣، طبقات ابن سعد ٢٦٨/٣، سیرت ابن ہشام ١٨٨/٢، فضائل

الصحابہ لاحمد ابن حنبل ۱/۲۸۰، سبل الھدیٰ والرشاد ۲/۴۹۴، ضیاء النبی ۲/۲۶۰) بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اعجاز قرآنی کے نئے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں، ان ہی پہلوؤں میں ایک پہلو قرآن کریم کا ''عددی اعجاز'' بھی ہے، نیاز صاحب نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے نقل کردہ اعداد وشمار خود ان کے مستخرجہ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے یہ اعداد کسی کتاب سے اخذ کیے ہیں اگر وہ اس کتاب کا حوالہ بھی دیدیتے تو خود بریٔ الذمہ ہوجاتے، اب اگر ان اعداد میں کوئی غلطی ہوتی تو اس کی ذمہ داری نیاز صاحب پر نہیں بلکہ اس کتاب کے مصنف پر ہوتی، یہ ہم اس لیے عرض کررہے ہیں کہ جب ہم نے ان اعداد وشمار کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا تو ان میں کئی جگہ غلطیاں نظر آئیں، مثلاً ''لفظ الناس (عوام، لوگ، غیر رسل) الرسل (رسول کی جمع) ۲۴۱، ۲۴۱ جگہ ہیں'' اس پر عرض ہے کہ الناس تو قرآن میں ۲۴۱ جگہ ہے مگر لفظ الرسل صرف ۳۴ جگہ ہے اب اگر تھوڑی وسعت دے کر رسلا (منصوب) ۱۰، رسلنا: ۱۷، رسلہ: ۱۷، رسلھم: ۱۲، رسلی: ۴، رسلک: ۱، رسلکم: ۱ وغیرہ کو بھی شمار کرلیں تو ان سب کا مجموعہ بھی ۲۴۱ نہیں بلکہ صرف ۹۶ ہورہا ہے، اب اگر اور وسعت دے کر رسول، مرسل اور مرسلین وغیرہ کو بھی جوڑ لیا جائے تو پھر یہ عدد ۳۶۸ تک پہونچ جائیگا، لکھتے ہیں کہ ''لفظ کفرا (منصوب) لفظ ایمانا (منصوب) کے برابر ۸ جگہ ہے'' حالانکہ لفظ ایمانا منصوب ۷ جگہ ہے، اسی طرح یہ بات کہ ''مہینے کے ۳۰ دن کی مناسبت سے لفظ ایام (دن) بھی ۳۰ جگہ ہے'' بھی درست نہیں کیونکہ لفظ ایام صرف ۲۳ مقام پر آیا ہے اب اگر ایاما (منصوب ۴ جگہ) کو بھی جوڑ لیں پھر بھی کل ۲۷ مقامات ہوئے، لکھتے ہیں کہ ''سال کے دنوں (۳۶۵) کی مناسبت سے لفظ الیوم (دن) بھی ۳۶۵ جگہ ہے'' حالانکہ لفظ الیوم صرف ۳۴۸ جگہ ہے اب اگر ان ۱۶ مقامات کو بھی جوڑ لیں جہاں یوما (منصوب) ہے تو یہ عدد ۳۶۴ ہوگا، قرآن کریم اس سے بے نیاز ہے کہ اس قسم کی کھینچ تان کرکے اس کا اعجاز ثابت کیا جائے **فانه یعلو و لا یعلیٰ علیه**۔ (مذکورہ اعداد وشمار کے لیے ہم نے **المعجم المفھرس**: فؤاد عبدالباقی اور الاعجاز العددی للقرآن: از عبدالرزاق نوفل پر اعتماد کیا ہے)

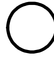
منظومات کے کالم میں جناب ریاض حسین چودھری صاحب کی نظم پسند آئی، معاصر نعت گوشعرا میں وہ اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں جس کا اظہار نظم کے ہر مصرعہ سے ہورہا ہے، لیکن پہلے بند کا دوسرا مصرعہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا...... ع

نعت کیا ہے، لاالہ کے نور کی ترتیل ہے

''نور کی ترتیل'' یہ ترکیب ہماری فہم ناقص سے بالاتر ہے، ایک مصرعہ میں ''پاک آغاز ہے'' لکھا ہے جو شاید ''پاک کا آغاز ہے'' ہونا چاہیے۔ خطوط کے کالم میں جناب خالد کمال صاحب کا خط پڑھا، ان سے ہماری گذارش ہے کہ جب ''آم میٹھے ہیں اور بہت ہیں'' تو غالب کی طرح آپ صرف آم کھانے سے سروکار رکھیئے، گٹھلیاں گننے میں وقت ضائع مت کیجئے۔

❑❑❑

اکتوبر۲۰۰۵ء



جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت سوانح ''یادوں کی بارات'' ماہر القادری مدیر'' فاران'' کو اس نوٹ کے ساتھ ارسال کی تھی کہ ''جناب ماہر! لیجیے بکرا حاضر ہے، شوق سے ذبح فرمایئے۔'' اور پھر ماہر القادری نے بھی اس شان سے بکرا ذبح کیا کہ تقریباً ۶۰؍صفحات میں تنقید کا حق ادا کردیا، ہمارے دوست مولانا خوشتر نورانی بھی کچھ اسی قسم کے نوٹ کے ساتھ ہر ماہ جام نور کی ایک کاپی ہمیں ارسال کردیتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ خود ان کی تحریریں ہی اب تک قربانی کا بکرا بنتی چلی آرہی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، کسی اردو مذہبی رسالہ کا سرورق اتنا دیدہ زیب اور خوبصورت بھی ہوسکتا ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے، مذہبی صحافت میں جام نور نے جہاں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں کی ہیں وہیں اس جدت کا سہرا بھی بجا طور پر اس کے سر ہونا چاہیے کہ اس نے سرورق تزئین اور ڈیزئننگ کا ایک نیا شعور دیا ہے، ورنہ اب تک تو صرف آستانوں کے گنبد ہی سرورق کی زینت ہوا کرتے تھے، اس مرتبہ کا ٹائٹل اتنا خوبصورت اور پرکشش ہے کہ......ع

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

اداریہ کا عنوان ''مادی انقلاب کے تباہ کن اثرات اور علما کی ثابت قدمی'' دیکھ کر ہم چونک گئے، یقین نہیں آتا کہ جس قلم سے چند ماہ قبل ''مدارس میں داخلہ کا خروش''، جیسی تیکھی تحریر نکلی ہو وہی قلم آج یہ لکھ رہا ہے کہ ''ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی معاشرہ کا ہر گھر یہ فیصلہ کرلے کہ اسے اپنے گھر میں کم از کم ایک فرد کو جید عالم دین ضرور بنانا ہے'' یہ اداریہ اس الزام کو بھی بے بنیاد ثابت کرتا ہے کہ مدیر اعلیٰ کا قلم طبقۂ علما کے حق میں ''خوشتر'' بننے کی بجائے ''نشتر'' کا کام کرتا ہے، کیونکہ اس اداریہ کے تیور اور لب ولہجہ علما کے لیے ناقدانہ اور جارحانہ نہیں بلکہ مدّاحانہ اور مدافعانہ ہیں، اگر خوشتر صاحب نے علما پر کبھی تنقید بھی کی ہے تو وہ کسی ذاتی پرخاش کی بنیاد پر نہیں

بلکہ خلوص دل اور نیک نیتی کے ساتھ کی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ''کنجشک فرومایہ'' قسم کے لوگ '' شاہین بلند پرواز'' کو قدامت پرست، رجعت پسند اور کٹھ ملا کہہ کر بالواسطہ دین و مذہب کا مذاق اڑا رہے ہیں تو ان کا قلم ایسے مذہب بیزار دریدہ دہنوں کے مقابلہ میں علما کے لیے ڈھال بن گیا، ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب بیزاری، مغرب زدگی اور مادہ پرستی کے اس طوفان میں ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر اور نان شبینہ پر قناعت کر کے ہمارے علمانے دین وملت کی آبرو بچائی ہے، مغربیت اور مادّیت کی مے دوآتشہ کے نشے میں چور اپنی عشرت گاہوں میں بیٹھ کر ترقی، جدیدت اور انقلاب کے کھوکھلے نعرے لگانے والے ان علماے ربانیین کے خلوص اور للّٰہیت کو کیا خاک سمجھ پائیں گے جنھوں نے صرف دین کی بقاء اور مذہبی روایات کی پاسداری کی خاطر تعیش زندگی کے مقابلہ میں عسرت وتنگدستی کو گلے لگالیا ہے۔

''پس منظر و پیش منظر'' کے تحت مولانا منظر الاسلام ازہری کا علمی و تحقیقی مضمون ''علم جرح وتعدیل پر مستشرقین کے اعتراضات کا تنقیدی مطالعہ'' زینت شمارہ ہے، مولانا ازہری کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمی و تحقیقی مزاج رکھنے کے ساتھ ساتھ وسیع المطالعہ بھی ہیں، ان کی فکر میں گہرائی اور قلم میں شگفتگی ہے، خامہ تلاشی شروع ہونے کے بعد سے ہی وہ '' خنجر آزمائی'' پر آمادہ ہیں اور ہم '' جگر آزمائی'' کو ہر وقت تیار، اسی لیے اب......ع اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل'' والی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، مولانا کا یہ مضمون وقیع اور معلوماتی ہے، البتہ بعض جگہ ہماری نظر رک گئی، منظر صاحب نے امام معمر بن راشد کی سن وفات ۱۵۴ھ لکھی ہے حالانکہ آپ نے ۱۵۳ھ میں وفات پائی تھی (دیکھئے: مولد العلماء و وفیاتھم، ج:۱،ص:۳۶۰ از محمد بن عبد اللہ الربعی، دار لعاصمۃ الریاض ۱۴۱۰ھ اور الحدیث والمحدثون،ص:۲۴۴ از محمد ابو زھو، دار الفکر القاہرہ) امریکی مستشرق کا نام مولانا نے اس طرح لکھا ہے Fan Gram Bawn حالانکہ نام کی صحیح اسپیلنگ یہ ہے Von Grun baun گولڈ زیہر کی کتاب کے نام میں بھی اسپیلنگ غلط ہوگئی ہے، صحیح نام یوں ہے Etudes sur la traditions Islamigue اسی طرح ابوریۃ کی کتاب کا نام اضواء علی السنۃ النبویۃ نہیں بلکہ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ہے، مستشرقین کے دوسرے

اعتراض کے جواب میں مولانا ازھری نے تین وجوہ ذکر کی ہیں، پہلی وجہ میں انہوں نے امام ذہبی کے حوالے سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں ناقدین رجال کو مصنف، متشدد اور متساہل تین اقسام میں بانٹا گیا ہے، اس طویل عبارت کا ترجمہ کر کے منظر صاحب نے قوسین میں ''میزان الاعتدال'' لکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے مذکورہ عبارت امام ذہبی کی میزان الاعتدال سے نقل کی ہے، یہ طریقہ جدید تحقیقی منہج کے خلاف ہے کہ حوالہ میں کتاب کی جلد، صفحہ، مطبع اور سن طبع کا ذکر کیے بغیر صرف کتاب کے نام پر اکتفاء کیا جائے، میزان الاعتدال ہمارے سامنے ہے اور ہم نے اس میں مذکورہ عبارت تلاش کرنے کی اپنی سی کوشش کر لی مگر تادم تحریر ہمیں یہ عبارت میزان میں نہیں ملی، اگر منظر صاحب جلد اور صفحہ کی نشاندہی فرمادیں تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔

''شخصیات اسلام'' میں جناب محمد نعیم برکاتی صاحب نے حضرت سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اچھا مضمون لکھا ہے، یہ مضمون ماہنامہ کنز الایمان شمارہ ستمبر میں بھی نظر سے گزرا، حضرت ابی بن کعب کا شمار فقہاء صحابہ میں ہوتا ہے اور آپ تاحیات منصب افتاء پر جلوہ افروز رہے، اسی سلسلہ میں محترم برکاتی صاحب لکھتے ہیں کہ ''خلیفۂ سوم حضرت سیدنا عثمان غنی کے دور خلافت میں بھی یہ منصب عظیم ان کو حاصل رہا'' پھر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ''حضرت عثمان نے اپنے دور خلافت میں جامعین قرآن کی مجلس کا رئیس حضرت ابی بن کعب کو مقرر فرمایا۔'' یہ دونوں باتیں اس وقت درست ہوں گی جب یہ ثابت کر دیا جائے کہ حضرت ابی بن کعب خلافت عثمانی میں بھی باحیات تھے، حالانکہ آگے چل کر خود برکاتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''حضرت ابی بن کعب نے مدینہ منورہ میں ۱۹ھ میں یعنی خلافت فاروقی میں وفات پائی اور جب آپ کی وفات ہوئی تو حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ آج سید المسلمین وفات پاگئے'' اب یہ معمہ تو محترم محمد نعیم برکاتی کو ہی حل کرنا ہے کہ جب بقول ان کے حضرت ابی بن کعب دور فاروقی میں وفات پاگئے تھے تو وہ خلافت عثمانی میں منصب افتاء پر کیسے رونق افروز ہوگئے اور آخر کس طرح حضرت عثمان نے اپنے دور خلافت میں ان کو جامعین قرآن کی مجلس کا صدر مقرر فرمادیا، اگرچہ برکاتی صاحب نے واقدی وغیرہ کے

حوالہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت ابی بن کعب کی وفات ۲۲ھ میں ہوئی تھی، اس روایت کو صحیح مان کر بھی بات نہیں بنتی کیونکہ خلافت عثمانی کا آغاز ۲۴ھ میں ہوا ہے۔

تحریری مباحثہ کا عنوان آج کا سلگتا ہوا موضوع ہے ''خودکش حملے امت کے تحفظ کے ضامن یا تباہی کے سامان'' اس عنوان کے تحت مولانا مبارک حسین مصباحی، مولانا وقار احمد ندوی اور مفتی آل مصطفیٰ مصباحی نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مولانا مبارک صاحب علوم دینیہ پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے حالات سے بھی باخبر رہتے ہیں اور صحافت سے وابستگی کی وجہ سے ایک رواں دواں قلم بھی رکھتے ہیں، بنیادی طور پر انہوں نے خودکش حملوں کو خلاف شرع قرار دیا ہے، غنیۃ المستملی کی ایک عبارت'' **حرمة المسلم الواحد ارجح من حرمة القبله**'' نقل کر کے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے ''ایک جان مسلم کا اتلاف کعبہ ڈھانے سے بدتر ہے'' ہمیں نہیں معلوم کہ اس ترجمہ کا تعلق ترجمہ نگاری کی کس صنف سے ہے، مولانا وقار احمد ندوی نے ان علماے عرب کے فتوے کی گول مول انداز میں یک گونہ تائید کی ہے جو ضرورتاً خودکش حملوں کو جائز قرار دیتے ہیں جب کہ مفتی آل مصطفیٰ صاحب کی مختصر مگر جامع تحریر خالص دارالافتاء کی زبان میں ہے، یوں تو انہوں نے خوش کش حملوں کو ناجائز ہی قرار دیا ہے مگر اہون البلیتین، ضرر خاص اور ضرر عام جیسی فقہی اصطلاحات کا سہارا لے کر انہوں نے مخصوص حالات میں خودکش حملوں کے جواز کی صورت بھی نکالی ہے، ''اظہار خیالات'' میں حضرت مولانا بہاء المصطفیٰ صاحب کی تحریر ہم نے دلچسپی سے پڑھی، ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور دوٹوک الفاظ میں اپنے موقف کا اظہار فرما دیا۔

برسوں جو پھونک پھونک کر رکھے گئے قدم

اک لغزش جنوں کے برابر نہ ہو سکے

مکرمی ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب نے اپنی کچھ ''الجھنیں'' پیش کر کے حضرت آسی کے شعر کی تشریح والی بحث کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے، جو صاحب علم بھی ڈاکٹر صاحب کی الجھنیں رفع کرنے کے لیے آگے آئیں وہ لگے ہاتھوں علامہ جامی کے اس شعر کی تشریح

کر کے ہماری الجھن بھی رفع فرما دیں۔

چوں آں بے چوں دریں چوں کرد آرام
پئے روپوش کردہ یو سفش نام

شکیل صاحب نے حضرت آسی کے ایک دوسرے شعری کی وضاحت طلب فرمائی ہے جس میں ذات باری پر ''عاشق زار'' کا اطلاق کیا گیا ہے، ویسے ہماری ناقص رائے میں اکابرین بالخصوص صوفیاءکرام کے اس قسم کے اشعار کی توضیح وتشریح اور افہام وتفہیم اگر خواص کی مجلسوں میں کی جائے تو زیادہ بہتر ہے، عوامی رسائل میں اس قسم کے اشعار کو معرض بحث میں لانا مناسب نہیں ہے، ورنہ ''جواب آں غزل'' کے طور پر مکرمی شکیل صاحب سے ہم بھی یہ وضاحت طلب کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ''صنم'' اور ''فتنہ عرب'' کہنا کیسا ہے؟ اگر ناجائز ہے تو پھر ایک مسلم بزرگ اور عارف باللہ کے اس شعر میں کیا تاویل کی جائے گی۔

روحی فداک اے صنم ابطحی لقب
آشوب ترک شور عجم فتنۂ عرب

مولانا کوکب نورانی صاحب کے سفرنامہ کی پہلی قسم زینت شمارہ ہے، اس کو پڑھنے کے بعد اب ہمیں دوسری قسط کا انتظار ہے، اس لیے کہ ممکن ہے کہ دوسری قسط میں کوئی خاص بات ہو۔

تربیت گاہ لوح وقلم میں مولانا نوشاد احمد مصباحی نے مصری ادیب علی احمد باکثیر کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ کیا ہے، علی احمد باکثیر (وفات ۱۹۶۹ء) کا شمار عربی کے صاحب نظر شعرا اور ادباء میں ہوتا ہے، افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی ان کا خاص میدان ہے، الفرعون الموعود اور عودۃ الفردوس ان کی مشہور کتب ہیں جو ہماری نظر سے گزر چکی ہیں، مولانا نوشاد صاحب نے اچھا ترجمہ کیا ہے اور سلاست وروانی برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، صوت کا ترجمہ انہوں نے صوت ہی کر دیا ہے حالانکہ یہاں ''ایک آواز'' ہونا چاہیے تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں'' تمہارا نام کیا ہے اور تو کہاں سے آیا ہے؟'' اس میں شتر گربہ کا عیب پیدا ہو گیا ہے، بعض جگہ زبان میں سقم بھی ہے مثلاً (۱) اگر وہ انتقال نہ کیا ہوتا (۲) کاش میں اس دن اس کی نصیحت

سنا رہتا(۳) آپ اپنے اس نشہ پر نہ مریں اگر آپ اپنے اس نشہ پر فوت کر گئے تو آپ کے لیے لمبی ندامت ہے(۴) میں تمہیں دل سے محبت کرتا ہوں، بہر حال یہ ایک اچھی کوشش ہے ہم مولانا نوشاد کی محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

منظومات کے کالم میں محترم ظہیر غازی پوری کی رباعیات اور مولانا اسید الحق بدایونی کی نظم ہمیں پسند آئی، پروفیسر ناز قادری صاحب کی نعت پاک بھی بہت خوب ہے، نعت کی ردیف ''تابندہ'' ہے، نعت میں ردیف کو بہت خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے مگر بعض مصرعوں میں معنوی طور پر ردیف نہیں نبھ رہی ہے مثلاً:

جنبش لب سے ہوئی وحی خدا تابندہ

جنبش لب سے وحی خدا کا تابندہ ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

ذکر معراج سے ہے حق کی رضا تابندہ

یہاں بھی ''تابندہ'' کا پیوند ہماری فہم ناقص سے بالاتر ہے۔

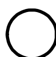
ارض دنیا پہ ہے شہر وفا تابندہ

اولاً ''ارض دنیا'' یہ ترکیب قابل غور ہے، دوسرا یہ کہ اس مصرع میں شاید کمپوزر سے کوئی لفظ رہ گیا ہے کیونکہ موجودہ صورت میں مصرعہ بحر سے خارج ہے۔

خطوط کے کالم میں محترم ظہیر غازی پوری کا خط پڑھا، مفتی عبید الرحمٰن صاحب سے اختلاف رائے کا غازی پوری صاحب کو پورا حق ہے، مگر انہوں نے اس حق کا استعمال جس ''ناحق'' طریقے سے کیا ہے وہ سنجیدہ اور علمی تنقید کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے، بہر حال ہمیں غازی پوری صاحب کے جوابی مضمون کا انتظار ہے جس کا انہوں نے وعدہ کیا ہے، یہ تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ ''تنقید فتوے کی طرح نہیں لکھی جاتی'' اب ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ آخر تنقید کس طرح لکھی جاتی ہے۔ مولانا اسید الحق بدایونی نے اپنے خط میں لکھا ہے (خامہ تلاشی کی وجہ سے) ''اب جام نور میں کچھ بھیجتے ہوئے ڈر لگنے لگا ہے'' اس پر عرض ہے کہ کسوٹی سے وہ لوگ ڈرتے ہیں جن کے سونے میں ملاوٹ ہوتی ہے، وہ لوگ جن کا سونا کھرا ہو وہ کسوٹی سے کبھی نہیں ڈرتے۔



نومبر ۲۰۰۵ء



اکتوبر کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، اس مرتبہ خوشتر صاحب نے قارئین کو دو تحفے دیئے ہیں، جام نور کے منتخب مضامین پر مشتمل بیک وقت چھ کتب کی اشاعت اور جام نور کو انٹرنیٹ پر پڑھنے کی سہولت، یہ دونوں تاریخی اقدام جام نور کی ترقی اور کامیابی کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اس پیش رفت پر ہم ادارہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

سرورق ہر ماہ کی طرح دیدہ زیب ہے، اب تک ہم سے ایک ناانصافی یہ ہوتی رہی کہ ہم سرورق کے حسن و دلکشی کے لیے خوشتر صاحب کے قصیدے پڑھتے رہے، حالانکہ اس کا سہرا تو جام نور کے تزئین کار جناب کوثر سمنانی کے سر ہونا چاہیے جن کی فنی مہارت اور اعلیٰ جمالیاتی ذوق کے نتیجہ میں ہمیں ہر ماہ ایک سے بڑھ کر ایک ٹائٹل دیکھنے کو مل رہا ہے، البتہ اس مرتبہ سرورق پر ایک نوخیز دوشیزہ کی دھندلی سی پرچھائیں دیکھ کر ہم چونک گئے، یہ جدت طرازی کہیں جام نور کے لیے مشکلات پیدا نہ کردے۔

اداریہ فکر انگیز ہے، ''دارالقضاء کے خلاف شرپسندوں کی شورش آئین ہند کی توہین ہے'' یہ اداریے کی سرخی ہے، جو دراصل ایک دعویٰ ہے، پانچ صفحات کا اداریہ اسی دعوے کی دلیل فراہم کرتا ہے. شرعی عدالتوں کی آئینی اور قانونی حیثیت پر جو شکوک وشبہات ذہن میں آسکتے تھے خوشتر صاحب نے ان کے تمام گوشوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور شرعی عدالتوں پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرنے والوں کو ایسا مسکت جواب دیا ہے کہ اگر دنیا میں انصاف و دیانت نام کی کوئی چیز باقی ہے تو کسی صاحب عقل و بصیرت کو شرعی عدالتوں کو غیر آئینی کہنے کی جرأت نہیں ہونا چاہیے، زبان و بیان کے رخ سے اداریے کے بعض جملے قابل توجہ ہیں مثلاً ''ایسا شرپسند طبقہ سامنے آیا جو سیکولرزم کی کینچلی اتار کر پورے ہندستان کو زعفرانی رنگ میں رنگنے کا خواب دیکھنا شروع کردیا'' یہ ''جو'' کا نہیں ''جس نے'' کا محل تھا یا پھر آخر میں ''خواب دیکھنے لگا'' ہونا چاہیے تھا، ''ماہرین قانون تشویش کا اظہار کرتے ہوئے

منصوبے بھی پیش کیے''. یہاں ماہرین قانون کے بعد ''نے'' ہونا چاہیے تھا، اسی طرح ''مقدمہ کی بیشمار پیشی'' نہیں بلکہ ''مقدمہ کی بے شمار پیشیاں'' ہونا چاہیے۔

مولانا اسید الحق بدایونی کا طویل مضمون ''نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت'' زینت شمارہ ہے، آخری آیت کے سلسلہ میں جتنی روایات ہیں مولانا نے سب کو جمع کیا ہے اور بحث و تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے آخر میں سورۂ بقر کی آیت نمبر ۲۸۱ نازل ہوئی ہے. ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں ''حضرت ابن عباس کی روایات جن طرق سے مروی ہیں ان میں سب سے بہتر اور جید طریقہ یہی علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس والا ہے''. مگر اس طریقۂ روایت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس سے علی ابن ابی طلحہ کی ملاقات اور سماع ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ سلسلۂ روایت منقطع ہے، پھر اس کو ''بہتر اور جید'' کیسے کہا جاسکتا ہے، امام السیوطی لکھتے ہیں ''**اجمع الحفاظ علیٰ ان ابن ابی طلحة لم یسمع من ابن عباس**'' (الاتقان ۵۶۵ دار مصر للطباعہ القاہرہ ۱۹۹۶ء) یہی اعتراض گولڈ زیہر نے بھی کیا ہے کہ جب یہ طریقہ منقطع ہے تو اس کے ذریعہ کی جانے والی تمام تفسیری مرویات مشکوک قرار پاتی ہے (گولڈ زیہر: مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۹۸، عربی ترجمہ: عبدالحلیم النجار، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، القاہرہ ۱۹۵۵ء) متقدمین میں حافظ ابن حجر اور متاخرین میں ڈاکٹر ابراہیم خلیفہ نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ مولانا اسید الحق نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''راقم الحروف کا مقالہ تفسیر ابن عباس ایک تحقیقی مطالعہ جام نور کے کسی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں'' ہمیں امید ہے کہ مولانا بدایونی آنے والے اپنے مقالے میں مرویات ابن عباس کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مذکورہ اعتراض کا تحقیقی جواب دینگے۔ اس بار ایک طویل عرصے کے بعد مولانا مقبول احمد مصباحی سے ملاقات ہوئی مگر......ع

توبہ ٹوٹی بھی تو ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

ہم ان سے گذارش کریں گے کہ مولانا اپنی صلاحیتوں سے انصاف کریں کیونکہ جماعت ان سے علمی و تحقیقی مضامین کی توقع رکھتی ہے۔ ''شخصیات اسلام'' میں مولانا نیاز

احمد مصباحی نے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی علیہ الرحمہ کا مختصر مگر اچھا تعارف کروایا ہے، نیاز صاحب نے ایک رباعی نقل کی ہے جس کے آخری مصرع میں ''صفحۂ دل'' کی بجائے ''صفحۂ اول'' کمپوز ہوگیا ہے-

''اظہار خیالات'' میں حضرت سید رکن الدین اصدق صاحب مدظلہ کی تحریر فکر انگیز ہے، ہمیں حضرت کی اس بات سے اتفاق ہے کہ اب صرف جام نور کے صفحات پر مفت مشورے اور خوشنما تجاویز پیش کرنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ میدان عمل میں آنا پڑے گا، مگر میدان میں آئے کون؟ ہم تو تسبیح کے دانوں پر رات دن ''مردے از غیب بروں آید وکارے بکند'' کا وظیفہ کرنے کے عادی ہوگئے ہیں، حضرت آسی علیہ الرحمہ کے ایک متنازع شعر کو مفتی شمشاد حسین صاحب نے ''شعرفہمی کی نہایت سطحی اور سرسری روایت سے ہٹ کر امعان نظر اور تعمیق فکر'' کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، جس کے نتیجہ میں انہیں اس شعر میں ''ناکام ترسیل، ناقص ابلاغ، اور فنی خامیاں'' نظر آئیں، ہماری ناقص رائے میں اگر مفتی صاحب یہ تحریر لکھنے سے پہلے دیوان آسی ص ۵۷، ۵۸، فتاویٰ امجدیہ ج ۴ ص ۲۷۸، اور جولائی کے شمارے میں مفتی عبید الرحمٰن صاحب کا مقالہ ''امعان نظر اور تعمیق فکر'' کے ساتھ ملاحظہ فرمالیتے تو ان کی تحریر ''تاویل القول بما لا یرضی به القائل'' کا عبرت ناک نمونہ نہ بنتی، مفتی صاحب کی اس تحریر پر تنقید وتبصرہ کا حق تو راغب احمد ناز ہی ادا کر سکتے ہیں-

دو ماہ کی طویل تلاش وجستجو اور بحث وتحقیق کے بعد آخر کار مولانا منظر الاسلام ازہری نے مہر سکوت توڑ ہی دی، اس کرم فرمائی پر ہم سراپا سپاس ہیں، ہم ان کی اس تجویز کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں کہ ''اب تعقبات کے عنوان سے ایک مستقل کالم شروع کیا جائے جس میں خامہ تلاش کا بھرپور علمی محاسبہ کیا جاسکے''...ع..سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی......جس بات پر بحث کا آغاز ہوا تھا یعنی کثرت طرق سے ضعیف حدیث حسن ہوتی ہے یا نہیں؟ اس پر منظر صاحب نے کچھ نہیں فرمایا، اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ منظر صاحب ہماری گذشتہ معروضات سے مطمئن ہوگئے ہیں اور انہوں نے اپنی تحریر پر نظر ثانی کی ہے. حدیث اربعین کے سلسلہ میں ہم نے صرف ابن معین کے لا یحتج به کا سہارا نہیں لیا تھا بلکہ اس سلسلہ میں

چار جلیل القدر ائمۂ حدیث امام النووی، امام دارقطنی، حافظ ابن حجر، اور امام البیہقی کی آراء بھی ذکر کی تھیں، اس کے جواب میں منظر صاحب نے کچھ لکھنے کی بجائے بحث کو صرف عبدالرحمٰن بن معاویہ کی ثقاہت وعدم ثقاہت پر مرکوز کر دیا، منظر صاحب دلیل کے نام پر صرف اتنا کہہ سکے کہ عبدالرحمٰن بن معاویہ کا ذکر ابن حبان نے اپنی الثقات میں کیا ہے اور ان سے سفیان وشعبہ نے روایت کی ہے لہٰذا وہ ثقہ ہیں، اس پر عرض ہے کہ امام النسائی نے عبدالرحمٰن بن معاویہ کے بارے میں فرمایا کہ لیس بثقہ (الضعفاء والمتروکین للنسائی صفحہ ۶۸ دار الوعی حلب ۱۳۶۱ھ) عمر الزھرانی نے امام مالک سے عبدالرحمٰن بن معاویہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ لیس بثقہ (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی ج ۴، ص ۳۰۹، دار الفکر بیروت ۱۹۸۸ء) اس کے علاوہ حافظ ابن حجر نے عبدالرحمٰن بن معاویہ کو ''سیئ الحفظ'' قرار دیا ہے (تقریب التہذیب ۳۵۰ دار الرشید سوریا ۱۹۸۶ء) یہ حوالے بھی ہم نے ''تبرعاً'' دیے ہیں ورنہ امام النووی، البیہقی، دارقطنی اور ابن حجر کے ذریعہ حدیث اربعین کے تمام طرق کی تضعیف کے بعد اب مزید کسی حوالے کی ضرورت نہیں رہ جاتی، منظر صاحب نے طبرانی کی حدیث کے سلسلے میں ہمارے دیے گئے حوالوں پر جو تنقید کی ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، ان کو ہم سے یہ گلہ ہے کہ سنن ابی داؤد، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند ابی یعلی کے جن صفحات کا ہم نے حوالہ دیا تھا ان میں طبرانی والی حدیث ''بعینہ اسی سند اور اسی متن'' کے ساتھ موجود نہیں ہے. بلکہ ان مقامات پر اسی معنی کی ایک دوسری حدیث ہے جو حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے جب کہ طبرانی والی حدیث حضرت ابن عباس سے مروی تھی. ہم چاہتے ہیں کہ مولانا ازہری صاحب کو ان کی وہ عبارت یاد دلائیں جس سے اس بحث کا آغاز ہوا ہے، آپ فرماتے ہیں ''ایک اور حدیث جس کو اگرچہ طبرانی نے ضعیف طریقہ سے روایت کیا ہے مگر ترمذی میں الفاظ کے اختلاف کے ساتھ دوسری سند موجود ہے، یونہی احادیث کی دیگر متعدد کتابوں میں بھی اس کا ذکر ہے''. اس سے قبل منظر صاحب ہماری ایک عبارت پڑھ کر ''سکتے'' میں پڑ چکے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ ہم اب جو انکشاف کرنے جا رہے ہیں اس کو پڑھ کر ایک بار پھر ان کو یہی ''زحمت'' کرنا پڑیگی. امام ترمذی کی جس حدیث کی طرف منظر

صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ حدیث حضرت ابن عباس سے نہیں بلکہ حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے اور یہ وہی حدیث ہے جس کی نشاندہی ہم نے ابوداؤد، مصنف ابن ابی شیبہ اور ابویعلیٰ کے حوالے سے کی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے منظر صاحب پر کوئی تنقید نہیں کی تھی بلکہ ان کے اس جملے "یونہی احادیث کی دیگر متعدد کتابوں میں بھی اسکا ذکر ہے" کی تائید کرتے ہوئے اس کو حوالوں سے مزین کر دیا تھا مگر ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر کسی حدیث کے شواہد، نظائر اور متابعات ذکر کیے جائیں تو منظر صاحب کے نزدیک "بعینہ وہی حدیث اسی سند اور اسی متن" کے ساتھ ہونا ضروری ہے، ورنہ یہ "محققانہ اسلوب کے منافی، جلد بازی سے کام لینے اور سنجیدگی سے کام نہ لینے" کے مرادف ہوگا، ہمیں امید ہے کہ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی منظر صاحب ہماری ان معروضات سے مطمئن ہو کر اپنی تحریر پر نظر ثانی کرینگے، اور آئندہ بھی تعقبات کے ذریعہ ہمارا "بھرپور علمی محاسبہ" کر کے مشکور فرمایں گے۔

اپنی خاطر ستم ایجاد بھی ہم کرتے ہیں
اور پھر نالۂ وفریاد بھی ہم کرتے ہیں

روبرو کے کالم میں شرعی عدالتوں کے خلاف سپریم کورٹ کے نوٹس پر مشاہیر اہل سنت کی آراء شائع کی گئی ہیں، ان مشاہیر میں ابتدائی دو نام دیکھ کر ہمیں خوشگوار حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، اگر مستقبل قریب یا بعید میں جماعت اہل سنت کی از سرِ نو شیرازہ بندی کے سلسلے میں اتحاد واتفاق کی کوئی فضا ہموار ہوتی ہے تو اس میں جام نور کی اس پہل کو ضرور یاد کیا جائے گا، کالم کی سرخی میں "سپریم کورٹ کی نوٹس پر" لکھا ہے حالانکہ نوٹس انگریزی لفظ ہے جو اردو میں مذکر استعمال ہوتا ہے لہٰذا "سپریم کورٹ کے نوٹس پر" ہونا چاہیے۔

جہان ادب میں مفتی آل مصطفیٰ مصباحی صاحب نے محترم ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب کی الجھنوں کا ازالہ فرمایا ہے مضمون ہمیں پسند آیا لیکن اگر ڈاکٹر صاحب کو مفتی صاحب کے تلخ لہجے اور جارحانہ تیور کا گلہ ہو تو وہ بالکل حق بجانب ہوں گے، لفظ عاشق پر مفتی صاحب قبلہ نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے شکیل صاحب کی الجھنیں دور ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں البتہ ہماری الجھنوں میں ضرور اضافہ ہو گیا ہے. جگہ کی قلت اور شکیل صاحب کے رد عمل کا انتظار،

ان دو وجوہ سے فی الحال اس پر ہم اپنا تبصرہ محفوظ رکھتے ہیں۔

مولانا ذیشان صاحب نے ''توہمات کی دنیا'' میں نہایت حساس اور نازک موضوع پر قلم اٹھانے کا خطرہ مول لیا ہے، انہوں نے کمال جرأت سے ہماری دکھتی ہوئی رگ پر صرف ہاتھ ہی نہیں رکھا بلکہ اس کا اچھا خاصہ آپریشن کر ڈالا ہے..ع..آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو...ممکن ہے ردعمل میں بعض ''خوش عقیدہ'' ان مراسم کے اثبات میں ''دلائل و براہین'' کا ایک انبار لیکر میدان میں کود پڑیں مگر بہرحال حقیقت کو عقیدت پر قربان نہیں کیا جاسکتا،

منظومات کے کالم میں جناب سید منظر چشتی صاحب، مولانا سید قمر شاہ صاحب جہانپوری، جناب سہیل فصیحی، اور جناب شیدا بستوی کی نعتیں شامل ہیں، سید قمر شاہ صاحب کی نعت ان کے ستھرے ذوق کی آئینہ دار ہے، مگر ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

اس روضۂ اطہر کی جالی گھر بیٹھے ہوئے میں دیکھا کروں
اس زخم کی قسمت کیا کہیے جو شمع شبستاں ہوجائے

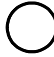
اس سے قطع نظر کہ ان دونوں مصرعوں کے درمیان کوئی ربط ہماری سمجھ میں نہیں آیا، شعرا نے زخم کو پھول یا گلِ تر تو باندھا ہے مگر زخم ''شمع شبستاں'' بھی ہوتا ہے یہ ہمیں نہیں معلوم تھا، غالبًا یہ خیال ''جدیدیت'' کے ذیل میں آتا ہے. جناب فصیحی صاحب کی تضمین بھی اچھی ہے مگر قد، حد اور رسد کے قافیے میں ''طلب'' کیونکر جائز ہے یہ تو فصیحی صاحب ہی بتائیں گے، جناب شیدا بستوی کی نعت بھی ہمیں پسند آئی، انہوں نے ''خدائی'' کا استعمال حکومت کے معنی میں بہت برمحل کیا ہے، البتہ مطلع کا پہلا مصرع قابل غور ہے......ع

دشت طیبہ کی مقدر میں رسائی لکھ دے

زبان کی رو سے ''دشت طیبہ تک رسائی'' یا ''دشت طیبہ میں رسائی'' درست ہوتا. دشت طیبہ کی رسائی درست نہیں ہے. اسی طرح کالی کملی کے تلے میری ''سمائی'' لکھدے..میں سمائی اگر سمانا سے مشتق ہے تو قابل غور ہے، سید منظر چشتی صاحب کو اس بار بھی ''مایوسی'' ہوئی ہوگی جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔



دسمبر ۲۰۰۵ء



رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا ہے، جب یہ شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا تو ماہ شوال کا پہلا ہفتہ ہوگا، لہٰذا ہم تمام قارئین کو عید الفطر کی پر خلوص مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

نومبر کا شمارہ اپنی تمام تر دلکشی، رعنائی اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہمارے ہاتھ میں ہے، سرورق کے سلسلہ میں جام نور ''خوب سے خوب تر'' کے طریقے پر گامزن ہے لہٰذا ہر ماہ اس کی تعریف میں کچھ لکھنا اب ایک رسم کی ادائیگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا، البتہ اس مرتبہ سرورق میں ایک تبدیلی یہ ہے کہ مضامین کی سرخیاں دینے کی بجائے اس بار اداریہ کا ایک اقتباس نمایاں کر کے شائع کیا گیا ہے، اقتباس کا انتخاب خوشتر صاحب نے ایسے ماہرانہ انداز میں کیا ہے کہ اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد آدمی کو پورا اداریہ پڑھے بغیر چین نہیں آئے گا۔

پانچ صفحات پر مشتمل اداریے کی سرخی ''نقشِ فریادی'' ہے، اداریے کے ابتدائی دو صفحات پڑھنے کے بعد ہم چونک گئے اور جتنا آگے بڑھتے گئے اتنا ہی حیرتوں کے دریا میں غرق ہوتے گئے، ہمیں محسوس ہوا کہ ہم جام نور کا اداریہ نہیں بلکہ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے شگفتہ قلم سے نکلی ہوئی کوئی تحریر پڑھ رہے ہیں، ''بعض صلاحیتیں وراثت میں منتقل ہوتی ہیں'' اگر سائنس کی اس تھیوری میں کسی کو شک ہو تو دادا کی کتاب ''لالہ زار'' کو سامنے رکھ کر پوتے کی اس تحریر ''نقشِ فریادی'' کا مطالعہ کر لے، اس تھیوری کی صداقت کا قائل ہو جائیگا، اداریہ میں امت کے جس المیہ کی طرف افسانوی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے وہ واقعی قابل توجہ ہے، تمثیلی پیرایۂ بیان میں ہمارے مردہ ضمیر پر جو نشتر لگائے گئے ہیں اس کی کسک ہر غیرت مند کو محسوس کرنا چاہیے۔ ''درگاہوں اور آستانوں میں زنجیروں سے لپٹے ہوئے نذرانوں کے ڈبوں'' کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تلخ اور صد فی صد حقیقت پر مبنی ہونے کے باوجود تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ ہمیں خوشتر صاحب کی اس بات سے

اتفاق ہے کہ ''متمول مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ زکوٰۃ ادا ہی نہیں کرتا'' مگر ہم ان کی توجہ اس طرف دلانا چاہتے ہیں کہ جو زکوٰۃ ادا کی بھی جا رہی ہے اس کا کتنا فی صد حصہ زکوٰۃ کے مستحق افراد کے ہاتھوں میں پہونچ رہا ہے؟

حیرت ہے کہ وسیع النظر اور حقیقت پسند مدیر اعلیٰ کو درگاہوں میں لٹکے ہوئے نذرانے کے ڈبے تو نظر آ گئے مگر وہ سیکڑوں فرضی اور خیالی مدارس اسلامیہ ان کی نظروں سے اوجھل رہے جو ''کوہ قاف'' کی کسی وادی میں تشنگانِ علم ومعرفت کو سیراب کر رہے ہیں اور جن کے سفیر ماہ مبارک کے آتے ہی حشرات الارض کی طرح ملک کے تمام بڑے شہروں میں پھیل جاتے ہیں اور اسلامیان ہند کی زکوٰۃ کا ایک بڑا حصہ کبھی **حیلۂ شرعی** کے نام پر اور کبھی کمیشن کے نام پر حاصل کر کے مستحقین کو ان کے حق سے محروم کر دیتے ہیں، ہم ان مدارس کی بات نہیں کر رہے جو اسلامی علوم کی اشاعت اور مذہبی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے گلشن اسلام کی کما حقہ آبیاری کر رہے ہیں ہمیں گلہ ہے تو ان گندم نما جو فروشوں کا جنھوں نے چندے کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے اور جن کے اداروں کا وجود صرف ان کے چندوں کی رسیدوں پر ہے، ہماری ناقص رائے میں جب تک اس قسم کے چندوں پر قدغن نہیں لگائی جاتی اس وقت تک زکوٰۃ کی رقم سے کوئی فلاحی نظام قائم کرنا ناممکن نہ سہی دشوار ضرور ہے۔

اداریہ میں بعض جگہ اس قسم کے جملے نظر سے گزرے ''توازن کو قائم رکھنے کے لیے'' اور ''ضرورتوں کو پورا کر سکیں'' وغیرہ، اردو نحوی قاعدے کی رو سے جو افعال متعدی بنفسہ ہوتے ہیں ان میں علامت مفعول ''کو'' کا استعمال جائز نہیں ہے، لہٰذا ''توازن قائم رکھنے کے لیے'' اور ''ضرورتیں پوری کر سکیں'' ہونا چاہیے تھا، ایک جگہ ''رند بادہ خوار'' استعمال کیا گیا ہے، رند اور بادہ خوار دونوں کا ایک ہی معنی ہے لہٰذا یہ ترکیب ''شبِ لیلۃ القدر'' کی طرح ہو گئی، سرور کائنات ﷺ نے ہرقل شاہ روم کے نام نامۂ مبارک ۶ ہجری میں نہیں بلکہ (راجح قول کے مطابق) ۷ ہجری میں روانہ فرمایا تھا۔

''البحوث فی الیہود'' سے تلخیص وترجمہ کر کے مولانا اعجاز انعام القادری صاحب نے ''عالم اسلام پر یہودیت کا کستا ہوا شکنجہ'' کے عنوان سے بہت معلوماتی اور وقیع مضمون

ترتیب دیا ہے، یہ مضمون کی پہلی قسط ہے، انہوں نے ترجمہ میں کافی حد تک سلاست وروانی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے مگر ''انہیں احکام الٰہی سنایا'' اور'' وہیں انتقال فرمائے'' جیسی ترکیبیں ذوق سلیم پر بار ہیں، ہیکل کے سلسلہ میں مولانا نے لکھا ہے کہ پہلا ہیکل حضرت سلیمان نے ۹۷۰ ق م میں تعمیر کروایا جس کو بخت نصر نے ۵۸۶ ق م میں تہس نہس کر دیا پھر پہلے ہیکل کی جگہ قورش فارسی نے ۵۱۵ ق م میں دوسرا ہیکل تعمیر کروایا جس کو'' ہیکل ثانی'' کہا جاتا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ (صیہونیوں کا دعویٰ ہے کہ) ''ہیکل سلیمانی کو مسلمانوں نے ڈھا دیا اور دیوار مبکی جو پہلے ہیکل کی دیوار تھی ابھی مسجد اقصیٰ کی دیواروں میں ایک ہے''، پھر آگے چل کر یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ''یہود کا اعتقاد ہے کہ مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار ہیکل ثانی کی دیوار ہے اس کا نام حائط مبکی ہے'' ان دونوں عبارتوں سے دو الگ الگ نتیجے نکل رہے ہیں، ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حائط مبکی پہلے ہیکل یعنی ہیکل سلیمانی کی دیوار ہے جب کہ دوسری عبارت بتاتی ہے کہ حائط مبکی ہیکل ثانی کی دیوار ہے، مولانا نے حائط مبکی کا ترجمہ دیوار مبکی کیا ہے حالانکہ اس کا ترجمہ'' دیوار گریہ'' کیا جاتا ہے، بہرحال یہ ایک اچھی کوشش ہے ہم امید کرتے ہیں کہ مولانا مصر میں رہنے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے آئندہ بھی اس قسم کے معلوماتی اور تحقیقی مضامین لکھتے رہیں گے۔

مولانا ذیشان احمد مصباحی صاحب نے ڈاکٹر برکات محمد مراد کی ایک تحریر کا ترجمہ کیا ہے، ڈاکٹر برکات کے پتہ میں پروفیسر جامعہ شمسِ عین لکھ گیا ہے حالانکہ یونیورسٹی کا نام جامعہ عینِ شمس ہے، مضمون کا عنوان ہے'' جالینوس عرب حکیم محمد بن زکریا رازی'' ہماری ناقص معلومات کی روشنی میں حکیم رازی کے لیے'' جالینوس عرب'' کا لقب سب سے پہلے ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب'' عیون الانباء فی طبقات الاطباء'' میں استعمال کیا یہ لقب رازی پر ایسا چسپاں ہوا کہ وہ اسی لقب سے مشہور ہو گئے، بعض مستشرقین نے'' عرب'' سے اپنے حسد کی وجہ سے رازی کو Persion Boyle یعنی فارسی بائیل کا لقب دے ڈالا، Robert Boyle برطانیہ کا مشہور فزکس اور کیمسٹری کا ماہر تھا، زیر نظر مضمون میں حکیم رازی کی سن ولادت'' غالباً ۲۵۰ھ مطابق ۸۶۴ء'' تحریر کی گئی ہے، معتبر تذکرہ وسوانح

نگاراور محقق عمر رضا کحالہ نے رازی کی سن ولادت ۲۵۱ھ مطابق ۸۶۵ء لکھی ہے (**معجم المؤلفین: ج۳ص ۳۰۴ مؤسسه الرساله بیروت ۱۹۹۳ء**) جبکہ ڈاکٹر محمد غریب جودہ کی تحقیق کے مطابق رازی کی سن ولادت ۲۴۰ھ مطابق ۸۵۴ء ہے (عباقرۃ علماء الحضارہ: ص ۹۰ مکتبۃ الاسرہ القاہرہ: ۲۰۰۴)

اظہار خیالات کا کالم اس مرتبہ کافی دل چسپ ہے، جناب ظہیر غازی پوری صاحب کا طویل مراسلہ ہم نے بڑے غور سے پڑھا، اوراس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نقاد کو تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے- ''عورت کا استحصال اور اس کا تدارک'' کے عنوان سے مولانا ایک القادری کی تحریر بھی پسند آئی، ان کی اس عبارت پر ہماری نظر رک گئی کہ ''رسول مقبول ﷺ نے ایک بار کی بیوہ سے نہیں بلکہ تین تین بار بیوہ ہوئی خاتون (خدیجہ) سے اپنا نکاح فرمایا''، آپ ﷺ کے عقد میں آنے سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کے دو خاوندوں کا تذکرہ تو عام طور پر سیرت نگاروں نے کیا ہے ایک عتیق بن عابد (بعض کے نزدیک عائذ) اور دوسرے ابوھالہ مالک بن نباش بن زرارہ (بعض کے نزدیک ابوھالہ ھند بن زرارہ بن نباش) مگر یہ تیسرے خاوند کون ہیں ان کے نام ونسب کا انکشاف تو مولانا ایک القادری ہی فرمائیں گے- جناب مشرف عالم ذوقی صاحب کا انٹرویو ہم نے ذوق وشوق سے پڑھا، مذہبی ادب کو ادب تسلیم نہ کرنا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے عام طور پر ادبی حلقوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے لہٰذا اگر ذوقی صاحب نے بھی وہی بات دہرادی تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے ہاں حیرت ہے تو اس پر کہ ''ادب نہ اصلاحی ہوتا ہے نہ تعمیری ہوتا ہے، بلکہ ادب صرف ادب ہوتا ہے''- یہ ایسی ''اجتہادی رائے'' ہے کہ اس کے حامی شاید ادبی حلقوں میں بھی بہت کم مل سکیں، ترقی پسند تحریک نے ''ادب برائے ادب'' کے تصور کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی ہے جو آخر کار ''ادب برائے زندگی'' کے تصور کو تسلیم کرواکے اپنے منطقی انجام کو پہونچی، جب ادب برائے زندگی ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ زندگی کی تعمیر واصلاح ہی کریگا، اب اس تعمیر واصلاح کا عمل یا تو کسی خاص مذہب کے اصول وقواعد کے تحت رونما ہوگا یا پھر مذہب سے ہٹ کر اپنے خود ساختہ اصولوں

کے تحت ہوگا جس طرح سرخ انقلاب کے حامی ادباء وشعرا نے مارکس اور لینن کے اصولوں کی روشنی میں ادب برائے زندگی کا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا، وہ مذہب کے منکر ضرور تھے مگر ان کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ ہم معاشرے کی اصلاح، انسانیت کی تعمیر نو اور دبے کچلے انسان کی ترقی کے لیے ادب کے ذریعہ انقلاب لانا چاہتے ہیں، اسی لیے اس کو ''انقلابی ادب'' کا نام بھی دیا گیا .لہٰذا یہ بات ہمارے حلق سے نیچے نہیں اتری کہ ادب صرف ادب ہوتا ہے وہ اصلاحی یا تعمیری نہیں ہوتا-

''ہماری الجھنیں''، ''الجھنوں کا ازالہ'' اور اب ''الجھنوں کا ناقص ازالہ'' کہانی بڑی دلچسپ ہے جواب اپنے پورے کلائمکس پر پہونچ گئی ہے-

مکرمی شکیل صاحب کو (ہماری توقع کے عین مطابق) مفتی آل مصطفیٰ صاحب کے ''جارحانہ تیور'' کا گلہ ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کی تحریر بھی کوئی کم جارحانہ نہیں ہے، عاشق زار کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ مفتی صاحب کی ''تاویل'' کے مقابلے میں زیادہ وزن دار معلوم ہوتا ہے، اب دیکھنا ہے کہ مفتی صاحب قبلہ کیا فرماتے ہیں یقیناً ان کی تحریر بھی قابل مطالعہ ہوگی، محترم ڈاکٹر سید علیم اشرف صاحب نے کافی عرصے کے بعد جام نور کے صفحات کو زینت بخشی ہے، ''قرآن کریم میں وجود معرب کا قضیہ'' ان کا تحقیقی شاہکار ہے، مضمون اتنا تحقیقی، وقیع اور ہر پہلو سے مکمل ہے کہ بے چارہ خامہ تلاش ہزار کوشش کے باوجود اس کے کسی گوشہ پر انگلی نہیں رکھ سکا سوائے اس کے کہ سید صاحب کی اردو پر عربی غالب ہے- مولانا کوکب نورانی صاحب کا سفرنامہ بالآخر اختتام پذیر ہوا، ہم مولانا کے سپاس گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے مجلّے ''الخطیب'' میں جولائی کی خامہ تلاشی کو دعوت فکر کے عنوان سے شائع فرمایا، حاصل مطالعہ کے کالم نے جام نور کے علمی معیار میں اضافہ کیا ہے، جامع الاحادیث کی ایک حدیث مولانا اسید الحق نے ڈھونڈ نکالی ہے، جامع الاحادیث ہمارے پیش نظر ہے، اس کی پانچویں جلد میں مولانا حنیف صاحب نے تقریباً ۵۱۰ راویانِ حدیث کے حالات مرتب کیے ہیں، ان میں تقریباً ٦٦ راوی ایسے ہیں جن کے بارے میں مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ''ان کے حالات

نہیں مل سکے'' اگر مولانا اسید الحق صاحب یا مولانا منظر الاسلام ازہری صاحب اس طرف توجہ فرمائیں اور ان ٦٦ راویوں کے حالات فراہم کر دیں تو یہ ایک علمی کام ہوگا اور کتاب اس پہلو سے بھی مکمل ہو جائیگی. فهل من مجيب؟

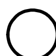
منظومات کے کالم میں مولانا صغیر اختر مصباحی کی نعت پاک بہت مرصع ہے فکر پاکیزہ، الفاظ شستہ اور انداز سادہ ہے، نثار کریمی صاحب کی نعت بھی عمدہ ہے، محترم ظہیر غازی پوری صاحب کا شمار صف اول کے ادباء ونقاد اور صاحب طرز، پر گو شعرا میں ہوتا ہے ان کی نعت پاک پسند آئی تاہم ایک دو جگہ ہمیں تأمل ہے۔

دیکھا ہے جب قریب سے، یہ منکشف ہوا
بڑھ کر نہیں کچھ آپ کے دربار کی طرح

دوسرے مصرع کی نثر یہ ہوگی'' آپ کے دربار کی طرح بڑھ کر کچھ نہیں'' ہماری ناقص رائے میں یہ'' کی طرح'' کا نہیں بلکہ'' سے'' کا محل ہے یعنی دربار سے بڑھ کر کچھ نہیں، اردو محاورے کی رو سے تو'' آپ سے بڑھ کر'' استعمال ہوتا ہے مگر چونکہ'' شاعر زبان ومحاورہ کا موجد بھی ہوتا ہے'' اس لیے'' آپ کی طرح بڑھ کر'' اگر کوئی جدید محاورہ دریافت ہوا ہو تو وہ ہمارے علم میں نہیں، جناب نازاں گیاوی صاحب نے اس بار خامہ تلاشی کو موضوع سخن بنایا ہے، ہم ان کے مشکور ہیں، انہوں نے ہماری معلومات میں یہ اضافہ فرمایا کہ معینی میں'' یاء منسوبی'' ہے ورنہ اب تک اس کو ہم'' یاء نسبتی'' سمجھتے تھے، محترم پروفیسر فاروق احمد صدیقی صاحب اور سید آل رسول حبیبی صاحب کے ہم شکر گزار ہیں کہ یہ حضرات خامہ تلاشی کو دلچسپی سے ملاحظہ فرماتے ہیں۔

❑❑❑

جنوری ۲۰۰۶ء



مشفق خواجہ نے کسی شاعر کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''کتابت اگر چہ غیر معیاری ہے مگر کلام سے بدرجہا بہتر ہے''۔ہم نے جب سے یہ جملہ پڑھا ہے اس وقت سے اس کے ''مناسب موقعِ استعمال'' کی تلاش میں ہیں،اس جملے کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ ہم اس طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ ''اس مرتبہ جام نور کا سرورق اگر چہ غیر معیاری ہے مگر اداریہ سے بدرجہا بہتر ہے''لیکن شاید ہمارے دوست خوشتر کو بھی یہ ضد ہے کہ وہ ہمیں یہ خوبصورت جملہ استعمال کرنے کا موقع نہیں دیں گے اور اس جملے کو استعمال کر کے جام نور کے قارئین سے دادو تحسین وصول کرنے کا ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پائے گا،اب آپ اسی شمارے کو ہی لے لیں سرورق اور اداریہ میں یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے زیادہ معیاری کیا ہے؟ سرورق کا ڈیزائن اور اداریہ کا موضوع دونوں میں ایک خاص ربط ہے یعنی دونوں کا تعلق ''بہار کی حالیہ سیاست'' سے ہے،اداریہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے جو سات صفحات پر مشتمل ہے،اداریوں کے سلسلہ میں جام نور کی روایت یہ ہے کہ اس کے اداریے عام طور سے ۴ یا ۵ صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں، بہر حال یہ اداریہ اپنی طوالت کے باوجود قابل مطالعہ ہے،اداریہ پڑھ کر ہم پر ایک انکشاف یہ ہوا کہ خوشتر صاحب اپنی دیگر صلاحیتوں کے علاوہ ایک اچھے سیاسی تجزیہ نگار اور مبصر بھی ہیں،انہوں نے بہار کے حالیہ سیاسی منظر نامے کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور ٹھوس دلائل کی روشنی میں بہار کی مختلف حکومتوں کی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہوئے موجودہ سیاسی صورت حال پر ایک نظر ڈالی ہے،اس پورے تجزیاتی سفر میں وہ غیر جانبدار رہے ہوں یا غیر جانبدار نظر آنے کی کوشش کر رہے ہوں،اس سے قطع نظر اب بہار کا سیاسی اونٹ اپنی کروٹ بیٹھ چکا ہے،لالو پرساد یادو کی ''لالٹین'' کا تیل ختم ہو چکا ہے اور جس بات کا خدشہ خوشتر صاحب نے ظاہر کیا ہے وہ بات اب زمینی حقیقت میں تبدیل ہو چکی ہے،یعنی لالو اور

پاسوان کی لڑائی میں ''سیکولر ووٹ'' ایک بار پھر تقسیم ہوگیا اور این ،ڈی ،اے کو مطلوبہ اکثریت حاصل ہوگئی ،اداریہ میں ایک ذیلی سرخی ''بہار کے انتخابات میں علما کی سرگرمیاں'' کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ چشم عبرت سے پڑھنے کے لائق ہے،اداریہ کی زبان حسب روایت شگفتہ اور رواں دواں ہے۔

''پس منظر و پیش منظر'' میں مولانا ابن اعجاز انعام القادری کے مضمون کی دوسری اور آخری قسط شائع کی گئی ہے،مولانا غالبًا جامعۃ الازہر میں زیر تعلیم ہیں،ان کا قلم اچھا ہے گو کہ اس میں ابھی پختگی نہیں آئی ہے،مگر اس کے باوجود ان کا یہ مضمون اتنا قابل قدر ہے کہ اگر ''تربیت گاہ لوح و قلم'' کالم ختم نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان کا یہ مضمون اس میں شائع ہوکر ضرور انعام کا مستحق قرار پاتا،مضمون کا عنوان ہے ''عالم اسلام پر یہودیت کا کستا ہوا شکنجہ'' اس میں مولانا نے ''صیہونی پروٹوکول'' کا تعارف کرواتے ہوئے یہودیوں کے ناپاک عزائم پر روشنی ڈالی ہے،مضمون کے بعض الفاظ اور جملے توجہ طلب ہیں مثلاً ''ان کی عظمت خراب کی جائے''،''غیر معینی صورت حال'' ''منصوبہ بند پلاننگ'' وغیرہ،دو جگہ ''یہودی پادری'' استعمال کیا گیا ہے،یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی صوفی کو ''مسلمان سادھو'' کہا جائے،پادری صرف عیسائی عالم کو کہتے ہیں،یہودی عالم کو ''حبر'' (جمع احبار) یا ''ربی'' یا ''حاخام'' کہتے ہیں،ایک جگہ لفظ ''تطور'' استعمال کیا گیا ہے،یہ خالص عربی لفظ ہے اردو میں استعمال نہیں ہوتا،یہاں لفظ ''ارتقاء'' ہونا چاہیے تھا،اسی طرح لفظ ''ملاحظہ'' جس معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے اردو میں وہ اس معنی میں مستعمل نہیں ہے۔

''حالات حاضرہ'' کے تحت مولانا ذیشان احمد مصباحی نے ''قصۂ قدیم و جدید'' کے عنوان سے شاہکار مضمون لکھا ہے،رفتہ رفتہ مولانا کے قلم میں نکھار اور فکر میں ایسی پختگی آتی جارہی ہے کہ ہمیں اب ان سے حسد نہ سہی تو کم از کم رشک تو ضرور ہونے لگا ہے،۵ صفحات پر پھیلا ہوا یہ مضمون قابل مطالعہ ہے۔

''شخصیات اسلام'' کے کالم میں مکرمی پروفیسر فاروق احمد صاحب نے حضرت مولانا عبدالرحمٰن محبی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کی دینی و ملی خدمات کا تعارف کروایا ہے۔ ہم

نے اپنی غفلت کے چلتے جہاں اپنے اکابرین اور جماعت کے محسنین میں سے بے شمار عظیم الشان شخصیات کو فراموش کر دیا ہے، انہی شخصیات میں حضرت مجی کا شمار بھی ہوتا ہے، مکرمی پروفیسر صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس فراموش شدہ شخصیت سے ہمیں متعارف کروایا، پورا مضمون ہم نے توجہ اور دلچسپی سے پڑھا مگر اس میں ہمیں کہیں یہ نظر نہیں آیا کہ حضرت مجی کی ولادت کہاں ہوئی تھی، کہاں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور آپ کی آخری آرام گاہ کہاں ہے؟ جب کہ کسی بھی سوانحی مضمون میں یہ چیزیں بہت ضروری ہیں، اتنا ضرور معلوم ہوا کہ آپ نے ''پوکھریرا'' نامی کسی جگہ ایک انجمن قائم فرمائی تھی، جغرافیہ کے سلسلہ میں ہماری معلومات انتہائی ناقص ہے، اس لیے ہمیں نہیں معلوم کہ یہ پوکھریرا کس ضلع یا کس صوبہ میں ہے-

اس مرتبہ ''تحریری مباحثہ'' اپنے عنوان، مواد اور قلم کاروں کے اعتبار سے کافی وقیع ہے. ''حمد ومناجات کی دینی اور ادبی قدر و قیمت کیا ہے؟'' اس موضوع پر چار اہل علم نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے، ہمارے ''غائبانہ کرم فرما'' مولانا ملک الظفر سہسرامی کی تحریر حسب سابق اس بار بھی کافی طویل ہوگئی ہے، جناب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مکرمی ڈاکٹر صابر سنبھلی اور محترم ڈاکٹر شاداب ذکی صاحب یہ تینوں حضرات غالبًا پہلی مرتبہ جام نور کی محفل میں شرکت کر رہے ہیں، ہم ان تینوں حضرات کو خوش آمدید کہتے ہیں، کسی تحریر پر صرف مناظر عاشق صاحب کا نام ہونا ہی ادبی اور علمی حلقوں میں اس تحریر کے معتبر ہونے کے لیے کافی ہے، اس تحریر میں بھی ان کی بلند فکر اور وسیع نظر کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے، ڈاکٹر صابر صاحب اور ڈاکٹر شاداب ذکی صاحب نے اگر چہ اختصار سے کام لیا ہے مگر موضوع سے پورا انصاف کیا ہے، ڈاکٹر شاداب صاحب کا شمار اردو کے ان چند شعرا میں ہوتا ہے جن کا حمد ومناجات پر پورا دیوان ہے، اس کی طرف مولانا سہسرامی نے اشارہ بھی کیا ہے-

اظہار خیالات کے حصے میں اس بار صرف ۳ صفحات آئے ہیں، جناب غلام حسین عباسی صاحب نے ''مدارس اسلامیہ کو خود کفیل بنانے کی ضرورت'' کے عنوان سے وہی سب کچھ لکھا ہے جو عام طور پر اس موضوع پر لکھا اور کہا جاتا ہے، اسی سے ملتے جلتے موضوع پر

جناب غلام مصطفیٰ قادری صاحب نے قلم اٹھایا ہے،تحریر کا عنوان ہے ''دینی مدارس کا ایک نصابی خاکہ''.اس میں مدارس اسلامیہ کے نصاب میں اصلاح وتجدید کے لیے کچھ مفید اور عمدہ مشورے دیے گئے ہیں،اگر جناب غلام مصطفیٰ قادری صاحب صرف یہ ایک جملہ لکھ دیتے کہ ''ہندستانی مدارس میں بھی جامعۃ الازہر کا نصاب اور نظام تعلیم رائج کردینا چاہیے'' تو وہ اس طویل تحریر کو لکھنے اور ہم اس کو پڑھنے کی زحمت سے بچ جاتے ،مدارس اسلامیہ کے بارے میں ان دونوں تحریروں پر ہم اپنی طرف سے کچھ تبصرہ کرنے کی بجائے اسی کالم میں شائع شدہ مولانا فخر الزماں نورانی کی حقیقت پسندانہ تحریر سے صرف دو جملے نقل کرنا کافی سمجھتے ہیں،مولانا لکھتے ہیں کہ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف تجاویز پیش کرنے اور خامیوں کو اجاگر کرنے سے کیا مسئلہ حل ہوجائے گا'' آگے لکھتے ہیں کہ ''اس طرح تو جام نور کے ذریعہ اپنی تحریری صلاحیت منوائی جاسکتی ہے مگر عملی اقدام مشکل ہے''۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا انٹرویو دلچسپ ہے،انہوں نے انور شیخ کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے،انور شیخ ایک متنازعہ شخصیت کے مالک ہیں،اپنی الحادی فکر اور مذہب مخالف تحریروں کی وجہ سے وہ اکثر سرخیوں میں رہتے ہیں اور شاید اس قسم کی تحریروں سے ان کا مقصد بھی یہی ہے،''جہان ادب'' کے کالم میں جناب ابراہیم اشک صاحب نے علامہ اقبال پر ان کی ''بہتان طرازیوں کا علمی محاسبہ'' کیا ہے،ابراہیم اشک صاحب کے مضمون کی یہ پہلی قسط ہے،انور شیخ نے ''حب الوطن من الایمان '' کو حدیث پاک سمجھ کر علامہ اقبال پر اعتراض کیا ہے،اس کے جواب میں اشک صاحب نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے مگر یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں،معتبر ناقدین حدیث کے نزدیک یہ حدیث ''لفظاً موضوع'' ہے،یہ الگ بات ہے کہ بعض علما نے اس کو معناً صحیح قرار دیا ہے،بہر حال ابراہیم صاحب کا مضمون قابل مطالعہ ہے،ہاں! علامہ اقبال کے ساتھ'' ضرورت سے زیادہ حسن عقیدت'' اور محمد علی جناح صاحب پر'' تلخ تبصرہ'' شاید بعض حضرات کو پسند نہ آئے۔

جناب ڈاکٹر مصطفیٰ شریف صاحب (صدر شعبۂ عربی جامعہ عثمانیہ) بھی غالباً پہلی مرتبہ

میکدۂ جامِ نور میں تشریف لائے ہیں، ہم ان کا استقبال کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی کرم فرماتے رہیں گے، ان کا وقیع مقالہ ''النبی الامی کے کمالاتِ علمیہ'' دیوانِ عام کی زینت ہے، ان کا یہ جملہ معنی خیز بھی ہے اور ان کے مسلک ومزاج کا پتہ بھی دیتا ہے کہ ''جب اُمّی کا ترجمہ ان پڑھ ہو تو نبی کا ترجمہ غیب داں کیوں نہ ہو؟ بس یہیں سے بعض مترجمین ومفسرین کے عقائد وتحفظات ذہنی کا پتہ چلتا ہے''۔ آیت کریمہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ کا ترجمہ ''قول طیب'' کے حوالے سے یہ کیا گیا ہے ''جو رسول کی اطاعت کیا وہ گویا اللہ کی اطاعت کیا''۔ مقالے کا آغاز عالمانہ رنگ میں ہوا ہے اور اختتام میں صوفیانہ رنگ آ گیا ہے، گویا دونوں کا حسین امتزاج ہے۔

اس مرتبہ منظومات کا کالم بہت وقیع ہے، جناب عارف ماہر آروی، محترم ناوک حمزہ پوری، مکرمی ڈاکٹر صابر سنبھلی اور پروفیسر ناز قادری صاحب کی حمد ونعت نے اس کالم کو ستاروں کی انجمن بنا دیا ہے، جناب عارف ماہر آروی نے حمد کے ذریعے ''اپنے مضطرب جذبوں کی تسکین کا سامان'' فراہم کیا ہے، ان کا ایک مصرع......شیطان کو مارو آیئے یہ رسم خلیل ہے

غالباً کمپوزر کا تختۂ مشق بن گیا ہے، کیوں کہ موجودہ صورت میں مصرع بحر سے خارج ہے، ان کا ایک شعر:

اب کیا چلے گا یوسف ثانی کوئی کہ جب
یعقوب ہے نہ باپ نہ ماں ہی رحیل ہے

اس سے قطع نظر کہ ہم '' چلے گا'' کا معنی ومفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں ہماری ناقص معلومات کی حد تک حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کا نام ''رحیل'' نہیں بلکہ ''راحیل'' ہے، ممکن ہے عروض کے کسی قاعدہ کے تحت ''ضرورت شعری'' کی بنیاد پر اعلام میں بھی تغیر جائز ہو، محترم ناوک حمزہ پوری صاحب کی نعت پاک کا ہر شعر ان کی فنکارانہ عظمت کا منھ بولتا ثبوت ہے، موصوف صاحب طرز اور کہنہ مشق شاعر ہیں، مگر ان کے ایک مصرع پر نگاہیں رک گئیں......''وہ جن کی وصف میں اللہ بھی ہے رطب لساں''

اس سے قطع نظر کہ کمپوزنگ کی غلطی سے ''جن کے وصف'' کی جگہ ''جن کی وصف'' ہوگیا ہے، یہاں اللہ کے لیے لفظ ''رطب لساں'' کا استعمال محل نظر ہے، ہمیں چونکہ نہ تنقید لکھنا آتی ہے اور نہ فتویٰ، اس لیے ہم اس پر تنقید کرنے کے لیے ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب اور فتویٰ دینے کے لیے مفتی آل مصطفیٰ صاحب کے حق میں دست بردار ہوتے ہیں۔مکرمی ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب کی نعت شریف اور مناجات دونوں بہت مرصع ہیں، ان کی مناجات کا ایک مصرع ہے:

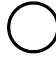
غمِ فراق میں خوں ریز چشم تر دے دے

''خوں ریز چشم تر'' غالباً جدید ترکیب ہے اب چونکہ یہ ترکیب صابر صاحب جیسے ماہر فن نے استعمال کی ہے لہٰذا درست ہی ہوگی، مقطع کے پہلے مصرع میں غالباً ''مدحت'' کی بجائے کمپوزنگ کی غلطی سے ''مدح'' لکھ گیا ہے جس کی وجہ سے مصرع بحر سے خارج ہوگیا ہے، محترم پروفیسر ناز قادری صاحب کی ۱۴/اشعار پر مشتمل طویل نعت شریف بھی قابل مطالعہ ہے، البتہ ''اک اک نقشِ کفِ پا'' میں جو تعقید ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ''اعجاز نمائی'' بھی ہمارے لیے بالکل نئی ترکیب ہے۔

''آپ نے کہا'' کے کالم میں ہم نے محترم مولانا کوکب نورانی صاحب کا خط دلچسپی سے پڑھا، بلکہ پڑھتے گئے اور ان کے شگفتہ طرز تحریر پر سر دھنتے گئے، ہم قبلہ نورانی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ''خامہ تلاشی والوں'' کو قابل اعتناء سمجھتے ہوئے ایک خوبصورت جملہ ان کی نذر بھی کر دیا، بہر حال ہمیں ان کے اگلے سفر نامے کا شدت سے انتظار ہے۔

❑❑❑

فروری ۲۰۰۶ء



لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

مشہور مثل ہے کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے مگر جب ہماری شامت آئی تو ہم جام نور کے دفتر جا پہونچے، خوشتر صاحب نے گرم جوشی سے استقبال کیا، ابھی ہم صحیح طرح بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ انہوں نے گزشتہ اداریوں پر ہماری تنقیدوں کے گلے شکوے شروع کر دئے، جب وہ پانی پینے کے لیے ذرا رکے تو ہم نے عرض کیا کہ اب ذرا ان جملوں پر بھی اظہار خیال ہو جائے جن میں ہم نے آپ کی (جا اور بے جا) تعریفیں کر کے دوستی نبھائی ہے، اس جوابی حملے کے لیے شاید وہ تیار نہیں تھے اس لیے ایک لمحے کو خاموش رہے اور پھر الماری سے جام نور ۲۰۰۵ء کی فائل اٹھا کر ہماری طرف بڑھا دی، ہم نے فائل کو ہاتھ میں لیا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے، خوشتر صاحب نے جواب دینے کی بجائے الٹا ہم سے سوال کر دیا کہ آج کل کس کتاب کا مطالعہ ہو رہا ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ مطالعہ سے ہماری طبیعت اب کچھ اکتا سی گئی ہے، ویسے اگر کبھی کوئی معیاری اور اچھی تحریر پڑھنے کو دل چاہتا ہے تو خود کوئی مضمون لکھ لیتے ہیں، خوشتر بولے کہ دراصل یہ سوال پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے بعض احباب کا مطالبہ ہے کہ جام نور ۲۰۰۵ء کی فائل پر معینی صاحب سے تبصرہ لکھوائیے، اس لیے اگر آج کل آپ فرصت میں ہوں تو اس فائل کا مطالعہ کر کے اس پر ایک جامع تبصرہ لکھ دیجئے- یوں تو خوشتر صاحب مطلق العنانی، آمریت، اجارہ داری اور ڈکٹیٹر شپ کے ایسے کٹر مخالف ہیں کہ گزشتہ ۳ سال میں اس کے خلاف آواز بلند کرتے کرتے ان کا گلا اور لکھتے لکھتے ان کے قلم کی روشنائی دونوں خشک ہو گئے ہیں، مگر کبھی کبھی وہ خود اس قدر ''آمرانہ'' رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کی بات ماننے ہی میں عافیت نظر آتی ہے، اور پھر

ہمیں یہ خطرہ بھی ہوگیا کہ اگر ہم نے تبصرہ لکھنے سے انکار کر دیا تو کہیں خوشتر صاحب انتقاماً مولانا ملک الظفر صاحب سے تبصرہ لکھوانے کی نہ ٹھان لیں کیوں کہ خامہ تلاش کی حیثیت سے خواہی نہ خواہی ہمیں پورا رسالہ پڑھنا پڑتا ہے. لہٰذا ہم نے تبصرہ لکھنے کی حامی بھر لی۔

اس غیر سنجیدہ تمہید کے بعد اب ہم نہایت سنجیدگی سے عرض کر رہے ہیں کہ گزشتہ دونوں فائلوں (۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء) کے مقابلے میں ۲۰۰۵ء کی فائل کہیں زیادہ دیدہ زیب، خوبصورت، وقیع اور معیاری ہے (آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر بہر حال ہم نے یہ بات اس لیے نہیں کہی ہے کہ اس فائل میں خامہ تلاشی بھی شامل ہے) سن ۲۰۰۵ء کا آغاز آہوں، سسکیوں اور شیون و ماتم کے ساتھ ہوا جو سنامی کی خوفناک لہریں اپنے ساتھ لے کر آئیں اور جاتے جاتے اپنے ساتھ لاکھوں گھروں کو مع مکینوں کے بہا لے گئیں، اور دیکھتے دیکھتے ڈھائی تین لاکھ انسان لقمۂ اجل بن گئے، اس کے علاوہ یہ سال ریٹا، کیٹیر ینا اور کشمیر کے زلزلہ کے لیے بھی یاد رکھا جائیگا، جام نور کے ساحل سے سنامی لہریں مفتی مطیع الرحمان مضطر صاحب کے اُس فتوے کی صورت میں ٹکرائیں جو دسمبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوا، اس فتوے میں انہوں نے ٹی.وی پر اسلامی پروگرام دیکھنے کو ''نہ صرف جائز بلکہ نہایت مستحسن'' قرار دے دیا، فتوے کا چھپنا تھا کہ ایک محشر بپا ہوگیا، مدیر اعلیٰ نے اپنے اداریے ''شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے'' اور ''عرض آخر'' میں اس قضیہ پر لکھا اور خوب لکھا، اس کے بعد تو یہ سلسلہ چل نکلا، ''ٹیلی ویزن بحث کی میز پر'' (جنوری) ''کیا تصویر کا دیکھنا بھی ناجائز ہے'' (مارچ) ''ہاں تصویر حقیقی کا دیکھنا بھی ناجائز ہے (اپریل) ''حرمت تصویر کے قائلین کے پاس کوئی معقول دلیل نہیں'' (جولائی) ''ہاں تصویر کا دیکھنا اور رکھنا دونوں جائز ہے'' (ستمبر) آخر الذکر تحریر سے کم از کم جام نور کے سرورق دیکھنے اور رکھنے کا جواز تو فراہم ہو ہی گیا، ویسے ہمیں ستمبر کا سرورق بہت پسند آیا، اداریے ہمیں سب پڑھنا پڑے اور ان میں سے کچھ پسند بھی آئے، سب سے ''ناپسند'' اداریہ دسمبر کا رہا کیوں کہ ہم اس میں زبان و بیان کی کوئی ''خامی تلاش'' نہیں کر سکے۔ جولائی میں دو اہم حادثے ہوئے، لندن میں بم دھماکے اور ایودھیا میں دہشت گردانہ کاروائی، دونوں حادثات میں ایک قدر مشترک یہ رہی کہ دونوں کا

ذمہ دار ''اسلامک آتنک واد'' کو قرار دیا گیا، جام نور میں ایک دھماکہ اس وقت ہوا جب مولانا بدرالقادری صاحب نے ورلڈ اسلامک مشن کے سلسلہ میں اپنے دیے گئے ایک بیان (مئی) سے یہ کہتے ہوئے پلہ جھاڑ لیا کہ یہ میرے خلاف خوشتر صاحب کی ''دہشت گردانہ کاروائی'' ہے، آخر مولانا یٰسین اختر صاحب کو تصفیہ کروانے کے لیے میدان میں آنا پڑا (اگست) ۲۹ اکتوبر کو دہلی خوفناک سلسلہ وار بم دھماکوں سے گونج اٹھی، جام نور میں اس قسم کے سلسلہ وار بم دھماکے تو نہیں ہوئے، ہاں البتہ پانچ سلسلہ وار مضامین ضرور شائع ہوئے، جس میں شررمصباحی صاحب کا سلسلہ وار مضمون (اپریل، مئی، جون) ''کلام امام اور ہماری سخن فہمی'' بلا شبہ ''بیت الفائل'' ہے، مولانا اسید الحق بدایونی کا طویل مقالہ (مئی، جون، جولائی، اگست) ''حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں'' تحقیقی ضرور تھا مگر تھوڑا سا ''تشویشی'' بھی ثابت ہوا ''پاکیزہ اور خوش گوار زندگی کا قرآنی تصور'' (مئی، جون، جولائی) یہ علامہ سید سعادت علی قادری صاحب کا ایک طویل اور وقیع مضمون ہے، ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کے پیش نظر ہم خامہ تلاشی میں اس پر کچھ ''خامہ فرسائی'' نہ کر سکے۔ مولانا کوکب نورانی صاحب کا سفرنامہ ''فدا ہو کے تجھ پہ یہ عزت ملی ہے'' (ستمبر، اکتوبر، نومبر) بھی دلچسپی سے پڑھا گیا، مگر پتا نہیں کیوں اکتوبر اور نومبر کے شمارے میں خوشتر صاحب نے اس سفرنامے کو فہرست مضامین میں درج نہیں کیا ہے، ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی صاحب کا طویل مضمون ''ہندستان کی قانونی تاریخ ایک تجزیاتی مطالعہ'' دسمبر ۲۰۰۴ء میں شروع ہو کر فروری ۲۰۰۵ء میں ختم ہوا، مضمون ختم کرتے کرتے نوشاد صاحب یہ دھمکی بھی دے گئے کہ ''میں مزید ایک مضمون اور لکھوں گا''۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ مضمون ''لکھ کر کے'' اس کو عملی جامہ پہنایا یا نہیں۔ اکتوبر میں مئو میں ہندو مسلم فساد ہوا اور اسی مہینہ میں بہار میں انتخابات بھی، اب یہ تو خوشتر صاحب ہی بتائیں گے کہ ان دونوں میں سے مسلمانوں کا زیادہ نقصان کس میں ہوا، لفظ انتخابات پر یاد آیا کہ ''تحریری مباحثہ'' کے لیے موضوع کا انتخاب بھی خوشتر کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے، اس سال کے مباحثوں میں ''اردو ادب میں نعتیہ شاعری کا مقام'' (جولائی) ''حمد و مناجات کی ادبی قدر و قیمت'' (دسمبر) اور ''تعلیم

نسواں‘‘(جون) قابل ذکر ہیں (اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی مباحثے ذکر کے قابل نہیں ہیں) جنوری کا مباحثہ’’دعوت اسلامی‘‘ کے تعلق سے تھا،اس میں مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ کچھ ایسا ہی تھا جس کی تردید مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب نے ضروری سمجھی (فروری). پھر مئی کے شمارے میں نعمانی صاحب نے ایک مفصل مضمون ’’دعوت اسلامی حقائق کی روشنی میں‘‘رقم فرمایا،لیکن مولانا زبیر قادری صاحب مطمئن نہیں ہوئے (جولائی)اس لیے ایک بار پھر مولانا نعمانی صاحب کو میدان میں آکر دعوت اسلامی کی صفائی دینا پڑی (اگست).اس سال میڈیا میں ’’عورت کی امامت‘‘،’’عمرانہ کیس‘‘اور ’’مسلم پرسنل لاء بورڈ‘‘ چھائے رہے،فرق اتنا رہا کہ پہلے مسلمانوں کو صرف ایک عدد بورڈ کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا اب اس خدمت کے لیے آدھا درجن بورڈ ہر وقت حاضر ہیں،مارچ کا اداریہ’’اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی لذت پہلے‘‘اسی کا مرثیہ ہے،مارچ کا’’روبرو‘‘ بھی اسی سے متعلق ہے،’’اظہار خیالات‘‘ کے کالم میں پرسنل لاء بورڈ جدید سے متعلق کئی ماہ تک تحریریں شائع ہوتی رہیں (مارچ،اپریل،مئی) یہ معاملہ اس وقت ٹھنڈا پڑا جب خود جدید بورڈ کے بانی کا انٹرویو شائع ہوا (ستمبر) جب بات انٹرویو کی آ ہی گئی ہے تو یہ بھی عرض کر دیں کہ جام نور کا مستقل کالم’’روبرو‘‘اس سال بھی بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھا گیا،خوشتر یہاں بھی اپنی ’’چابک دستی‘‘ سے باز نہیں آئے،مذہبی اور ادبی دونوں حلقوں سے شخصیتیں لاتے رہے،اگر ایک طرف مفتی نظام الدین صاحب جیسی’’دارالافتائی‘‘شخصیت سے ملاقات کروائی تو دوسری طرف مشرف عالم ذوقی جیسے’’خالص ادیب‘‘ کے گھر جا پہونچے،گویا’’رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی‘‘ دراصل یہی توازن جام نور کی کامیابی کا راز ہے،اپریل کے مہینہ میں سری نگر سے مظفر آباد تک بس سروس شروع کی گئی،یہ ہندو پاک دوستی کی سمت ایک نیا قدم تھا،اسی مہینہ میں ایک گمنام اور اجنبی قلم کار اپنا شکستہ قلم اور چند بوسیدہ کتابیں لیے ہوئے’’کنج خمولے‘‘ سے نمودار ہوا اور دسمبر آتے آتے وہ ایک’’ایشیا گیر معمہ‘‘بن گیا.جی ہاں اپریل کے مہینے میں جام نور کی’’خامہ تلاشی‘‘شروع کی گئی اور مئی میں’’خامہ تلاش‘‘ کی تلاش میں گھوڑے دوڑا دئے گئے (جو اب تک ’’بحر ظلمات میں‘‘ دوڑ رہے ہیں) ابتدا میں اسے’’خام

تلاشی'' یا ''خامیاں تلاشی'' کہا گیا اور پھر کچھ ایسی ''بدگمانیاں'' پیدا ہوگئیں کہ لوگوں نے اس غریب کو ''دائرۂ انسانیت'' سے خارج کر کے ''جنات'' بنا دیا، بہر حال ہم اپنے تمام قارئین کے شکر گذار ہیں کہ ان کی طرف سے جو پذیرائی، قدردانی، اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے وہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی. اب جب کہ گیارہویں خامہ تلاشی آپ کے ہاتھ میں ہے، ہم آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکے ہیں اور اب الٹی گنتی شروع ہوگئی ہے، کم ازکم خوشتر صاحب سے تو یہی طے پایا تھا، کیونکہ......ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

دروغ برگردن راوی ''جام نور اب مرکز انتشار وافتراق بن چکا ہے'' پھر بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جام نور کی یہ فائل ''انتشار وافتراق'' سے پاک ہو، صورت حال یہ ہے کہ مکرمی شکیل صاحب اپنی الجھنیں پیش کر رہے ہیں اور مفتی آل مصطفیٰ صاحب نے ان کے ازالہ کی قسم کھالی ہے، دونوں حضرات کا ''جذبۂ احقاق حق'' اپنے عروج پر ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت مفتی عبید الرحمٰن صاحب نے ''حضرت آسی کے ایک شعر کی تشریح'' کے سلسلہ میں ایک سنجیدہ مضمون تحریر فرمایا (جولائی) جناب ظہیر غازی پوری صاحب کو یہ ''فتویٰ نما تنقید'' یا ''تنقید نما فتویٰ'' پسند نہیں آیا (ستمبر) اسی درمیان مکرمی شکیل اعظمی صاحب اس شعر کی تشریح کو لے کر الجھن کا شکار ہوگئے (ستمبر) اکتوبر کے شمارے میں مفتی آل مصطفیٰ صاحب نے ''الجھن کا ازالہ'' کرنے کی کوشش کی، اسی شمارے میں ایک دوسرے مفتی صاحب نے اس شعر کو سمجھنے میں کچھ زیادہ ہی ''امعان نظر اور تعمیق فکر'' سے کام لے لیا، انہوں نے اس شعر کی ایسی تشریح کر ڈالی جو شاید شعر کہتے وقت حضرت آسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ ہو، اس کو اگر حضرت آسی ملاحظہ فرماتے تو شاید یہی کہتے کہ ......ع......شعر مرا بمدرسہ کہ برد اس معاملہ سے متعلق تیسری تحریر جناب شیدا بستوی صاحب کی تھی جنہوں نے ظہیر غازی پوری صاحب کے ایک جملہ پر احتجاج کیا تھا، نومبر کا شمارہ اپنے ساتھ شکیل صاحب کا ایک اور تحقیقی مضمون لے کر آیا اور انہوں نے ازالے کو ''ناقص'' قرار دیتے ہوئے مفتی صاحب کو ایک نئی الجھن سے دوچار کردیا، ادھر ظہیر غازی پوری

نے شیدا بستوی پر ''پلٹ وار'' کیا (نومبر)، پھر جنوری (۲۰۰۶ء) کے شمارے میں مفتی آل مصطفیٰ صاحب نے اپنے ناقص ازالہ کو کامل کرتے ہوئے ''الجھن سلجھا'' کر اردو میں ایک نئے محاورہ کا اضافہ کر دیا، اب......ع

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

اس سال جام نور کی ٹیم میں ایک نئے چہرے کا اضافہ ہوا، یہ ہیں مولانا ذیشان احمد مصباحی جو جنوری سے دسمبر تک ۹ مضامین لکھ کر باعزت بری ہو چکے ہیں، خدا ان کو نظر بد (اور ہمارے قلم) سے محفوظ رکھے، مولانا ملک الظفر سہسرامی صاحب کو اس سال مضمون نگاری کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا تو انہوں نے اپنے شوق خامہ فرسائی کی تسکین ''مکتوب نگاری'' کے ذریعہ کر لی، ۱۲ شماروں میں ان کے ۷ خط شائع ہوئے، ویسے ''طلاق ثلاثہ اور پرسنل لاء بورڈ'' (فروری) ''نعتیہ شاعری'' (جولائی) اور ''حمد ومناجات'' (دسمبر) پر ان کی تحریریں قابل مطالعہ ہیں. ڈاکٹر سید علیم اشرف صاحب اس سال جام نور سے کچھ خفا رہے، پورے سال میں ان کی صرف ایک تحریر شائع ہوئی (نومبر) آپ پڑھیں یا نا پڑھیں مگر ہمیں تو منظومات کے کالم میں شائع ہونے والے تمام شعرا کو پڑھنا پڑتا ہے، اس سال سب سے زیادہ منظومات محترم پروفیسر ناز قادری صاحب کی شائع ہوئیں (مئی، جولائی، ستمبر، دسمبر) اور سب سے کم محترم شرر مصباحی کی (یعنی ایک بھی نہیں) نومبر کے شمارے میں جناب شفیع اللہ راز اٹاوی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے اس میں صرف ۹ شعر ہیں، خوشتر صاحب نوٹ کر لیں غزل کا دسواں شعر یہ ہے۔

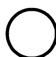
کوئی انسان بھی تنہا نہیں ہے
کراماً کاتبیں ہے ساتھ اب تک

یہ دسواں شعر ہمیں اس لیے یاد ہے کہ راز صاحب کی یہ دس اشعار کی غزل جام نور جون ۲۰۰۳ء میں بھی شائع ہو چکی ہے. ''آپ نے کہا'' کے کالم میں کبھی کبھی بڑے دلچسپ خط شائع ہوتے رہے، سب سے زیادہ خط اور رپورٹیں مولانا سید قمر شاہ جہان پوری کی شائع ہوئیں، شکر ہے کہ ہماری ایک ''خفیف سی چٹکی'' صرف ان کی مسکراہٹ کا سبب بنی ورنہ عام طور پر ایسی ''چٹکی'' سے لوگوں کی ''سسکیاں'' نکل جاتی ہیں، ملی اور جماعتی سرگرمیوں میں

ماہنامہ ماہ نور کا اجراء (مئی) تنظیم ابنائے اشرفیہ کی تشکیل اور الازہر انسٹی ٹیوٹ کا بدایوں میں قیام قابل ذکر ہیں۔ آخر میں اگر مولانا منظر الاسلام ازہری صاحب کا ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی، ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ وہ ''تعقبات'' کے ذریعہ ہمیں مطالعہ اور تحقیق کا موقع فراہم کرتے رہے، آخر کوئی تو ''حریف مئے مرد افگنِ عشق'' سامنے آیا۔

❑❑❑

مارچ۲۰۰۶ء



عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جام نور وقت کا بہت پابند ہے، ہر ماہ کی ۱۲ تاریخ کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے اور ہر حال میں مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک قارئین کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، لیکن اگر تازہ شمارہ کے سرورق کا اعتبار کیا جائے تو ہمیں اس مرتبہ جام نور ایک سال تاخیر سے موصول ہوا ہے، یعنی فروری ۲۰۰۵ء کا شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء میں ہمارے پاس آیا ہے، چلئے خیر یہ غلطی پہلی بار ہوئی ہے اس لیے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

مئی کے جام نور میں روبرو کے تحت جناب سید صبیح رحمانی صاحب نے خوشتر صاحب سے فرمایا تھا کہ ''آپ نے ایسے ایسے موضوعات کو اپنے قلم کے ذریعہ چھیڑا ہے جن کو ہم بند کمروں میں بھی کہتے ہوئے ڈرتے ہیں''، اس مرتبہ اداریہ کا موضوع بھی شاید ایسے ہی نازک موضوعات میں سے ایک ہے، اداریہ کا عنوان ہے ''بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے''، اداریہ مختصر ضرور ہے مگر انتہائی فکر انگیز ہے، خوشتر صاحب نے ہمارے جس المیہ پر نہایت جرأت سے قلم اٹھایا ہے اس پر زبان کھولنا خود کو خطرہ میں ڈالنے کے مترادف تھا، یہ اداریہ صرف خوشتر صاحب کے دل کی آواز نہیں ہے بلکہ ہماری جماعت کے تمام سنجیدہ، دردمند اور مثبت فکر رکھنے والے افراد کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہے، ہم نے کسی گزشتہ خامہ تلاشی میں لکھا تھا کہ ''اگر مستقبل قریب یا بعید میں جماعت اہل سنت کی ازسرنو شیرازہ بندی کے سلسلہ میں اتحاد و اتفاق کی کوئی فضا ہموار ہوتی ہے تو اس میں جام نور کی اس پہل کو ضرور یاد کیا جائیگا'' ہمارے اس جملہ کو موجودہ اداریہ نے مزید اعتبار فراہم کیا ہے، خوشتر صاحب نے جن معنوں میں خود کو روشن خیال، جدت طراز، روایت شکن، اور آزاد رو قرار دیا ہے ایسی روشن خیالی، جدت طرازی، روایت شکنی، اور آزاد روی کو ہم سلام کرتے ہیں، وہ جدت طرازی جو جماعت اہل سنت میں اتحاد فکر و نظر کی دعوت دیتی ہو اس قدامت پرستی سے کہیں بہتر ہے جو خانقاہوں، درسگاہوں، اور بزرگوں کے نام پر جماعت کو

خانوں میں تقسیم کرنے کے درپے ہو اور ایسا روایت شکن جو اشتراک عمل اور پر امن بقاء باہمی کا داعی ہو وہ اس روایت پرست سے ارفع واعلیٰ ہے جو ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں بنانے ہی کو سنیت کی سب سے بڑی خدمت گمان کرتا ہے۔

اس بار مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب نے کافی عرصہ کے بعد کرم فرمایا، پس منظر وپیش منظر کے تحت ان کا مختصر مگر وقیع مضمون ''ٹائی کی تاریخی حیثیت'' زینت شمارہ ہے، انہوں نے مختلف تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ٹائی اور صلیب میں باہم کوئی ربط نہیں ہے بلکہ ٹائی کی ایجاد اور اس کے چلن کے دوسرے اسباب تھے، ہمارے جن اکابر علما نے ٹائی کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے حرمت کی بنیاد اسی بات پر رکھی ہے کہ ٹائی دراصل صلیب کی شکل ہے جس کو گلے میں لٹکانا نصاریٰ کا شعار ہے، ویسے مولانا غلام زرقانی صاحب نے کشادہ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے صاف الفاظ میں فرمادیا ہے کہ ان کا یہ مضمون ٹائی کی شرعی حیثیت کا تعین نہیں کرتا بلکہ صرف ارباب افتاء کو دعوت تحقیق دے رہا ہے، ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی تحقیق جلد بازی، سطحیت، اور شخصیت پرستی کے جذبوں سے سرشار ہو کر نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی اور گہری نظر کے ساتھ ہونا چاہیے، زیر نظر مضمون تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتا ہے، گو کہ اس میں معتبر تاریخی حوالے دئے گئے مگر ٹائی کی تاریخی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے یہ حرف آخر نہیں ہے، ہمارے جن اکابرین نے ٹائی کو صلیب مانا ہے یقیناً ان کے پاس بھی کچھ نہ کچھ تاریخی شواہد ضرور ہونگے، ان کو بھی سامنے لانے کی ضرورت ہے، ہاں البتہ ٹائی کی حرمت کا فتویٰ دیتے وقت اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ شعار کفر اور شعار کفار دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور دونوں کے احکام جدا جدا ہیں، اسی طرح **تشبہ بالکفار** بھی ''مطلقاً'' ممنوع نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی تفصیل ہے، اولاً تشبہ کی دو قسمیں ہیں التزامی اور لزومی، اور پھر ان میں سے ہر ایک کی متعدد اقسام ہیں، حدیث پاک ''**من تشبه بقوم فهو منهم**'' تشبہ التزامی کی تین صورتوں میں سے حقیقتاً صرف ایک صورت سے خاص ہے، بہر حال ہم مولانا زرقانی صاحب کے اس سنجیدہ اور تحقیقی مضمون کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس

سلسلہ میں مزید سنجیدہ اور علمی تحریریں منظر عام پر آئیں گی تاکہ مسئلہ کی تحقیق میں مدد ملے۔

''حالات حاضرہ'' کے تحت مولانا ذیشان احمد مصباحی کا فکر انگیز مضمون پڑھ کر ایک بار پھر ان کی صلاحیتوں کا معترف ہونا پڑا، مضمون کا عنوان ہے ''حقیقت کیا ہے؟''.اس میں مولانا نے عالمی منظر نامہ کے تناظر میں میڈیا کی اسلام دشمنی، یہود کی فریب کاری اور اسلام مخالف سازشوں پر روشنی ڈالی ہے،مولانا نے کسی ماہر اور منجھے ہوئے صحافی اور تبصرہ نگار کی طرح خبروں اور واقعات کا گہرا تجزیہ کیا ہے،زبان کے رخ سے اگر اس مضمون کا جائزہ لیا جائے تو یہ خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ مولانا کا قلم پختہ اور اسلوب شگفتہ ہوتا جا رہا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس مضمون میں زبان واظہار کی بعض غلطیاں در آئی ہیں،مثلاً اس میں کم از کم ۴ مقامات پر لفظ ''ایجنسی'' کو مذکر استعمال کیا گیا ہے جب کہ ایجنسی اردو میں مؤنث استعمال ہوتی ہے،ایک جگہ ''حسینۂ عالم کوئز'' استعمال کیا گیا ہے،مضمون نگار نے غالباً ''کوئز'' کو اردو لفظ مقابلہ کا متبادل گمان کیا ہے حالانکہ کوئز صرف سوال وجواب کے مقابلہ کو کہتے ہیں ،مقابلۂ حسن یا اس قسم کے مقابلوں کے لیے انگریزی لفظ کونٹیسٹ (Contest) استعمال ہوتا ہے.ایک مشہور مصرعہ میں معمولی سا تصرف کر دیا گیا ہے صحیح مصرع یہ ہے......

ع......زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو،ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں''وہ عینک جو آج ہماری نگاہوں کو بے نور بنا رکھی ہے'' یہ جملہ پڑھ کر ایسا لگا جیسے دہلی کی لذیذ بریانی کھاتے کھاتے اچانک کوئی کنکر منھ میں آ گیا ہو۔

''شخصیات اسلام'' کے کالم میں محترم ڈاکٹر محمد عبدالحمید اکبر صدر شعبۂ اردو وفارسی گلبرگہ یونیورسٹی کا تحقیقی مضمون بعنوان ''حضرت خواجہ بندہ نواز اور ان کی علمی وتحقیقی تصانیف کا تعارف'' زینت شمارہ ہے، جام نور کی محفل میں غالباً یہ ان کی پہلی شرکت ہے،ہم ڈاکٹر صاحب کا خیر مقدم کرتے ہیں،مضمون ہمیں پسند آیا،اس میں نہایت تحقیقی اسلوب میں حضرت خواجہ بندہ نواز کی تقریباً ۲۰ تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے،اکثر تصانیف کے بارے میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ یہ کس سن میں اور کہاں تصنیف کی گئی،مگر ایک کمی کا شدت سے احساس ہوا کہ صرف ایک کتاب کے بارے میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس کا قلمی

نسخہ کتب خانۂ بندہ نواز میں محفوظ ہے، اور دو کے بارے میں یہ وضاحت ہے کہ یہ دو کتابیں حیدرآباد سے شائع ہوچکی ہیں، اس کے علاوہ باقی ۱۷ کتب کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ہے کہ یہ کتب موجود ہیں یا زمانہ کی دست برد کا شکار ہو کر مفقود ہوگئیں؟ اگر موجود ہیں تو قلمی شکل میں ہیں یا طبع ہوچکی ہیں؟ اگر قلمی ہیں تو کہاں ہیں؟ اور اگر طبع ہوگئی ہیں تو کہاں سے اور کس سن میں؟ جب کسی کی تصانیف کا تعارف کروایا جارہا ہو تو مذکورہ امور کی نشاندہی جدید تحقیقی اسلوب کا لازمہ ہے۔

اس مرتبہ تحریری مباحثہ کا عنوان ہے ''غیر اسلامی عصبیت ملی مفاد کے حق میں کتنی مضر ہے'' اس عنوان کے تحت مولانا یٰسین اختر مصباحی، مولانا ارشاد احمد ساحل سہسرامی اور مولانا سجاد احمد مصباحی کی فکر انگیز تحریریں زینت شمارہ ہیں، مولانا یٰسین اختر صاحب کی بصیرت افروز تحریر حسب سابق اختصار اور جامعیت کا خوبصورت نمونہ ہے، گروہ بندی، تفریق، امتیازات، اور مشربی عصبیت کو حرف غلط کی طرح مٹا کر جماعتی اتحاد و اتفاق کا خواب کون نہیں دیکھتا مگر مولانا مصباحی اس سلسلہ میں جذبات اور خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتے بلکہ انہوں نے زمینی حقائق کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اتحاد و اتفاق کے تمام امکانات کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''امتیازات وتفریق کی دیوار منہدم کرنے اور سب کو متحد کرنے کی مہم وقتی اور ہنگامی طور پر کسی اہم معاملہ میں تو کامیاب ہوسکتی ہے مگر وہ مستقل اور دیرپا ثابت نہیں ہوگی، اس لیے اس سے زیادہ کی کوشش باعث اجر وثواب تو ہے مگر عملاً اس کا نتیجہ صفر ہی رہیگا'' آگے لکھتے ہیں ''ہر چیز میں اتحاد کی بجائے اشتراک عمل کی بات کی جائے''، اس حقیقت پسندانہ تجزیہ سے ہم مکمل اتفاق کرتے ہیں. مولانا ساحل سہسرامی کی تحریر بھی معلوماتی اور فکر انگیز ہے، ان کی فکر اور اسلوب دونوں نے متأثر کیا، گزشتہ پندرہ سال کے اندر سنی حلقوں میں جو مثبت تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کا ذکر اگرچہ مباحثہ کے موضوع سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رکھتا اس کے باوجود ہمیں پسند آیا ہے، ہاں مولانا ساحل صاحب اگر خوشتر صاحب سے یہ احتجاج کریں کہ ان کے نام کے ساتھ'' شہسرامی'' کی بجائے سہسرامی کیوں لکھا گیا تو اس احتجاج میں وہ ہمیں بھی اپنا ہمنوا پائیں گے۔ مولانا سجاد

مصباحی صاحب نے اختصار کے باوجود موضوع سے پورا انصاف کیا ہے- اظہار خیالات کے کالم میں مولانا منظر الاسلام صاحب ایک بار پھر نمودار ہوئے ہیں مگر انہوں نے اپنی گزشتہ سنجیدہ، علمی اور تحقیقی تحریروں کے برخلاف اس تحریر میں کہیں ہمارے دعوے پر قدغن لگائی ہے تو کہیں ہماری قلعی کھولی ہے، کہیں تحدیث نعمت کے جلوے بکھیرے ہیں تو کہیں ہماری چالاکیوں کا پردہ چاک کیا ہے، کہیں اِس غریب کو الفاظ کا بازیگر اور عجلت پسند قرار دیا ہے تو کہیں راہ فرار تلاش کرنے والا، کہیں ایسا تو نہیں کہ دلائل کے خلاء کو غیض وغضب سے پُر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے؟ اگر ایک خالص علمی اور تحقیقی بحث میں محترم منظر صاحب کا یہی اسلوب اور یہی تیور رہے تو پھر ہم ان سے مزید گفتگو کرنے سے قاصر ہیں......ع

بیا کہ من سپر انداختم اگر جنگ است

کیونکہ موجودہ تحریر میں منظر صاحب نے جس زبان کا استعمال کیا ہے اس میں بہر حال ہم ان سے نہیں جیت سکتے - اظہار خیالات میں دوسری قابل مطالعہ تحریر حضرت مولانا سید رکن الدین اصدق چشتی صاحب مدظلہ کی ہے، آپ نے دعوت اسلامی کے بعض نادان دوستوں پر مخلصانہ اور مصلحانہ لب ولہجہ میں تنقید کی ہے، سید صاحب کی اس دردمندانہ تحریر کو عقیدتوں کے شیریں جذبہ سے نہیں بلکہ حقیقتوں کے تلخ تناظر میں دیکھنا چاہیے، کیونکہ دعوت اسلامی صرف ایک فرد یا ایک خانقاہ کی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ پوری جماعت اہل سنت کی امانت ہے-

''جہان ادب''میں مکرمی ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب کا طویل مضمون ''احتساب''ہم نے غور سے پڑھا، جناب رضوان عالم نوری کو ہم سے شکوہ ہے کہ ہم اس مسئلہ پر ''محض خاموش تماشائی'' بنے ہوئے ہیں، جب کہ ہمیں اس معاملہ میں حکم کا کردار ادا کرنا چاہیے، رضوان صاحب کا حسن ظن اپنی جگہ مگر ''ایاز اپنی قدر خوب جانتا ہے''، جب معاملہ میر عبدالواحد بلگرامی، تاج الفحول بدایونی، حضرت فاضل بریلوی، سرکار آسی، اور صدر الشریعہ جیسے اکابرین کا ہو تو وہاں جرأت اظہار کے ذریعہ اپنی ''عاقبت'' داؤں پر لگانے کی بجائے خاموش تماشائی بنے رہنے ہی میں عافیت ہے-

آں جا کہ عقاب پر بریزد

ایں پشہ نیم جاں چہ خیزد

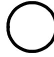
دیوان عام میں حضرت سید رکن الدین اصدق صاحب کا مضمون ''بے شک بریلوی کوئی فرقہ نہیں'' قابل مطالعہ ہے، یہ دراصل سہ ماہی جام شہود بہار شریف (جنوری، فروری ، مارچ) کا اداریہ ہے، ہم سید صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے جولائی کی خامہ تلاشی سے نہ صرف یہ کہ ایک طویل اقتباس نقل فرمایا ہے بلکہ اپنی تائید کی مہر لگا کر اس کو مستند کر دیا ہے۔خزینۂ معرفت کے کالم میں مولانا اسید الحق بدایونی کا مختصر مضمون ''علامہ یوسف القرضاوی اور جماعت سلفیہ'' یقیناً دلچسپی سے پڑھا گیا ہوگا۔منظومات کے کالم میں پروفیسر نازقادری صاحب، سید قیصر خالد فردوسی اور نثار کریمی صاحب کی نعتیں عشق و ایمان میں تازگی کا باعث ہیں، جناب فردوسی صاحب کی نعت غیر منقوط ہے، اس گئے گزرے دور میں بھی اس قسم کی صنعت کو برتنا انہی کا حصہ ہے البتہ اگر مطلع کے مصرعۂ اولیٰ پر نظر ثانی کر لی جائے تو بہتر ہے، جناب نازاں گیاوی صاحب نے ''جام نور'' کے عنوان سے عمدہ اشعار کہے ہیں، سیر گلشن کا لطف تو ہم نے بھی اٹھایا ہے مگر ''غنچۂ و گل کا شگوفہ'' آج تک نظر سے نہیں گزرا، غزل میں ایک شعر ''خامہ تلاش'' کے لیے بھی ہے، یہ نازاں صاحب کی محبت ہے ورنہ......ع

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا

خطوط کے کالم میں پروفیسر فاروق احمد صاحب کا خط پڑھ کر ایک بار پھر اس مقولے کی صداقت کا یقین ہو گیا کہ ''بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں'' انہوں نے جس کشادہ قلبی سے ہماری معروضات کو قبول فرمایا ہے اس سے ان کا قد اور اونچا ہو گیا ہے، خوشتر صاحب کے توسط سے ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اپنی تازہ تصنیف ''افہام و تفہیم'' ارسال فرمائی ہے ، اس ذرہ نوازی پر ہم سراپا سپاس ہیں۔

❑❑❑

اپریل ۲۰۰۶ء



تازہ شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، یہ شمارہ کئی جہتوں سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے، سرورق تو ہر ماہ قابل دید ہوتا ہی ہے مگر اس مرتبہ اداریہ بھی قابل مطالعہ ہے، ''عظمت رفتہ کی امین خانقاہیں اور دور جدید کے چیلنجز'' کے عنوان سے خوشتر صاحب نے پانچ صفحات پر جو موتی بکھیرے ہیں ان کی چمک اور دلکشی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، صالح معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں خانقاہوں کا کردار اور ان کے اثرات، تصوف اور خانقاہوں کے معترضین کے مختلف طبقوں کا جائزہ، خانقاہوں سے دور جدید کے تقاضے، اور چند مرکزی خانقاہوں کی انقلابی پیش رفت، ان ذیلی عناوین کے تحت اپنے مخصوص دلکش انداز میں مدیر اعلیٰ نے نہ صرف یہ کہ تاریخ کے اوراق پلٹ کر اہل خانقاہ کو ان کی اصل ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے بلکہ ان کو عظمت رفتہ کی بازیافت کا شعور اور حوصلہ بھی دیا ہے- اداریہ کے بعض جملوں پر (بقول پیر زادہ اقبال احمد فاروقی) بے ساختہ ''قربانت شوم'' کہنا پڑتا ہے، دیکھئے'' ذوق عمل ہو تو فرسودہ زنجیریں خود کٹ جاتی ہیں اور یقین کی ایڑیوں سے زم زم کا چشمہ ابل جاتا ہے'' تاہم بعض جگہ زبان و بیان یا بالفاظ دیگر ''کمپوزنگ'' کی غلطیاں ذوق سلیم پر بار ہیں، مثلاً ''پہلے ظاہری علوم دیا گیا''، احکام الٰہیہ ان کی فطرت ثانیہ بن گئی''، ''عقل و خرد یہ قبول کرنے میں قطعی تامل نہیں کرے گا''، ''یہ ایک ایسی بدعت ہے جو مشرکانہ عقائد اور رسوم کو فروغ دے رہا ہے''، ''تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کیے جا رہے ہیں'' وغیرہ، تُنسَخ کا ترجمہ ''منتقل کیے جاتے ہیں'' غالباً'' بامحاورہ ترجمے'' کے ذیل میں آتا ہے-

پس منظر و پیش منظر کے کالم میں مولانا سید سیف الدین اصدق صاحب کا مضمون ''گجرات میں آج بھی قیامت'' اشک بار آنکھوں سے پڑھا گیا، سید صاحب قبلہ ایک سنجیدہ ،شگفتہ اور باوقار قلم کے مالک ہیں، ان کا زیر نظر مضمون ساڑھے چار صفحات پر مشتمل ہے، ابتداء میں تمہید کے طور پر سید صاحب نے گجرات میں مسلمانوں کی آمد، گجرات پر مسلم سلاطین

کی فوج کشی، گجرات کی مجالس علم وفن، وہاں کی تہذیب وثقافت، صنعت وحرفت، زراعت وباغبانی، مدارس، کتب خانوں، صوفیاء اور خانقاہوں وغیرہ کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے، تین صفحات کی یہ تمہید معلومات افزا، قیمتی اور دلچسپ ہے مگر مضمون کے عنوان سے لگاّ نہیں کھاتی، اصل موضوع پر سید صاحب نے صرف ڈیڑھ صفحہ تحریر فرمایا ہے، سید صاحب نے غالب کا ایک شعر نقل فرمایا ہے اس کے دوسرے مصرع میں تھوڑا سا تصرف واقع ہو گیا ہے، صحیح مصرع یوں ہے......ع

میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

''شخصیات اسلام'' کے کالم کو اس مرتبہ محترم ڈاکٹر سید علیم اشرف صاحب نے زینت بخشی ہے، سید علیم اشرف صاحب کا شمار ہماری جماعت کے ان محققین میں ہوتا ہے جو جماعت اہل سنت کے لیے بجا طور پر سرمایۂ افتخار ہیں، ڈاکٹر صاحب موصوف نے امام جلال الدین سیوطی کے ایک مختصر رسالے ''**الشرف المحتم**'' کا ترجمہ فرمایا ہے اور اس پر تحقیقی حواشی بھی رقم فرمائے ہیں، امام سیوطی نے اس مختصر رسالے میں سیدی احمد کبیر رفاعی قدس سرّہ کی ایک کرامت کا اثبات فرمایا ہے، سیدی رفاعی جب ۵۵۵ ہجری میں حج کے بعد مدینہ محبوب کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے، تو ان کے لیے ان کے جد کریم سرور کائنات ﷺ نے اپنا دست مبارک قبر انور سے باہر نکالا، آپ نے اس کو بوسہ دیا، وہاں موجود نوے ہزار لوگوں نے اپنے ماتھے کی آنکھوں سے اس روح پرور منظر مبارک کا مشاہدہ کیا، اس موقع پر بے شمار اقطاب، ابدال اور اولیاء موجود تھے، روایات کے مطابق اس موقع پر غوث اعظم شہنشاہ بغداد بھی وہاں جلوہ گر تھے، اس سے سلسلۂ رفاعیہ کے بعض افراد نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سیدی رفاعی کا مقام ومرتبہ حضور غوث اعظم سے بھی ارفع واعلیٰ ہے، اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے رسالہ ''**طرد الافاعی عن حمی هاد رفع الرفاعی**'' تصنیف فرمایا، اس میں اعلیٰ حضرت نے ''**تفریج الخاطر فی مناقب الشیخ عبدالقادر**'' کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ بعینہ یہی واقعہ ایک موقع پر حضور غوث اعظم کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔

اس مرتبہ ''تحریری مباحثہ'' کا عنوان ہے ''کیا مدارس میں عربی کی تدریس اصلاح کا تقاضا کرتی ہے؟'' اس میں مولانا انوار احمد خاں بغدادی، مولانا نفیس احمد مصباحی، اور مولانا ذکی اللہ مصباحی نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مولانا انوار احمد صاحب کے نام کے ساتھ ''بغدادی'' کی نسبت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالباً عراق کے کسی جامعہ سے فارغ ہیں، اور شاید ابھی ''تازہ واردِ بساطِ عشق'' ہیں، ان کے قلم کی کاٹ، غضب ناک لہجہ، اور خطرناک تیور اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ عربی زبان وادب کی تعلیم میں ہندستان کے مدارس اسلامیہ کو بھی بغداد وسامرئ کے عربی جامعات کے ہم پلہ دیکھنا چاہتے ہیں، البتہ مولانا نفیس مصباحی صاحب کی تحریر میں اعتدال وتوازن کا عنصر غالب ہے، مولانا نے تمہید میں مدارس اسلامیہ کے موجودہ نصاب کی غرض وغایت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے، اور آخر میں عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے کچھ مفید مشورے بھی دئے ہیں، مولانا ذکی اللہ مصباحی کی تحریر بھی قابل مطالعہ ہے۔

اس بار ''اظہار خیالات'' کے کالم نے جام نور کے لگ بھگ نو صفحات پر قبضہ کیا ہے، الجھنوں اور ازالوں کے سلسلہ میں محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب قبلہ کی فیصلہ کن تحریر زینت شمارہ ہے، ادارتی نوٹ میں خوشتر صاحب کا یہ جملہ پڑھ کر ہماری طرح قارئین نے بھی سکون واطمینان کی سانس لی ہوگی کہ ''متنازع شعر پر مزید تحقیق وتفتیش کا دروازہ بند کیا جاتا ہے، اب ادارہ اس موضوع پر کسی بھی تحریر کو شائع کرنے سے قاصر ہوگا''- جناب فرحان عطاری صاحب پاکستانی باشندہ ہیں لہٰذا انہیں اپنے ملک اور بانی مملکت سے محبت ہے اور ہونا بھی چاہیے، انہوں نے محمد علی جناح صاحب کے سلسلہ میں جناب ابراہیم اشک صاحب کے ایک ریمارک پر اپنا احتجاج درج کروایا ہے، جس کا انہیں پورا حق حاصل ہے، لیکن اس بات سے حیرت ہوئی کہ بعض لوگ ایک سیاسی معاملہ کو بھی دیوبندی اور سنی مسلکوں کے تناظر میں دیکھ رہے ہیں، گویا پاکستان کی حمایت سنی عقیدہ اور اس کی مخالفت دیوبندی عقیدہ، ع......

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اوراس پر یہ خوش فہمی کہ ہندستانی سنی محمد علی جناح صاحب کے خلاف بولنے پر سیاسی طور پر مجبور ہیں ورنہ ان کے دل ہمارے ساتھ ہیں، یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی ہندستانی سنی یہ کہے کہ ''جناح صاحب کو قائداعظم اور رحمۃ اللہ علیہ لکھنا ہمارے پاکستانی سنی احباب کی سیاسی مجبوری ہے ورنہ ان کے عقائد اور مسلک سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں''، ظاہر ہے کہ یہ بات اتنی ہی بے بنیاد ہے جتنی پہلی والی، بہرحال ہم اپنے پاکستانی احباب کے جذبات واحساسات کی پوری قدر کرتے ہیں اوران کے ملک کے لیے ترقی اور خوش حالی کی دعا بھی۔

پتا نہیں ''فضلاء ازہر'' اِس غریب پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ کہ پہلے مولانا منظر ازہری پھر مولانا سلمان ازہری اور اب مولانا اسید الحق ازہری اپنے ''تعقبات'' لے کر میدان میں آئے ہیں، خیر ہم ان کا استقبال کرتے ہیں ......ع...... بیاضِ مردمِ چشمِ من آشیانۂ تست

اگر چہ مولانا اسید الحق صاحب نے خود کو منظر کے طرفداری کی بجائے سخن فہم کی حیثیت سے پیش کیا ہے مگر تحریر کا بین السطور گواہی دے رہا ہے کہ یہ ''دیرینہ رفاقت'' نبھانے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے، مولانا اسید الحق صاحب نے بھی اپنے ''رفیق دیرینہ'' کی طرح عبدالرحمٰن بن معاویہ کو ثقہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، چلیئے تھوڑی دیر کو مان لیا کہ مذکورہ راوی ثقہ ہے ، مگر پھر بھی ان کی ثقاہت آپ حضرات کو مفید نہیں ہے کیوں کہ عبدالرحمٰن بن معاویہ کے بعد کے رواۃ متکلم فیہ ہیں، میں آپ دونوں حضرات کو دعوت دیتا ہوں کہ اس حدیث کی پوری سند پر اپنے ''ازہری مطالعہ'' کی روشنی میں غور فرمائیں، اوراس حدیث کی صحت ثابت کردیں، اور اگر نہیں تو یہ کم علم اور بے بضاعت اپنے ''محدود ہندستانی مطالعہ'' کی روشنی میں اس حدیث کے تمام رواۃ کا تحقیقی اور تحلیلی تجزیہ کر کے اس کی تضعیف ثابت کرنے کو تیار ہے، مولانا اسید صاحب نے یہ بھی خوب کہی کہ ''جب ابن الجوزی مطلقاً ''یحییٰ'' فرماتے ہیں تو اس سے یحییٰ بن سعید مراد ہوتے ہیں'' ہمیں نہیں معلوم کہ مولانا نے یہ ''قاعدہ کلیہ'' کہاں سے اخذ فرمایا ہے، ہم پورے یقین سے عرض کرتے ہیں کہ زیر بحث عبارت میں یحییٰ سے یحییٰ بن سعید نہیں

بلکہ یحییٰ ابن معین ہی مراد ہیں،اس پر قرینہ یہ ہے کہ العلل المتناہیہ کے علاوہ نقد رجال کی دوسری کتب مثلاً الکامل فی ضعفاء الرجال، میزان الاعتدال،اور ضعفاء العقیلی میں صراحتاً موجود ہے کہ عبدالرحمٰن بن معاویہ کو یحییٰ ابن معین نے **لا یحتج بحدیثه** کہا ہے، جب کہ ابن معاویہ کے بارے میں کسی کتاب میں یحییٰ بن سعید کی جرح یا تعدیل موجود نہیں ہے، مولانا اسید صاحب نے ہماری ایک غلطی یہ دکھائی ہے کہ ہم نے ''بشر بن عمر الزہرانی'' کو ''عمر الزہرانی'' لکھدیا ہے، چلئے تسلیم کیا کہ ہم سے نام نقل کرنے میں غلطی ہوگئی مگر محترم اس سے اصل بحث پر کیا فرق پڑا؟؟ وہ بشر بن عمر الزہرانی ہوں یا عمر الزہرانی بہر حال یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ انہوں نے امام مالک سے عبدالرحمٰن بن معاویہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ''**لیس بثقه**''،اوراس کے آپ بھی معترف ہیں،لہٰذا ہماری دلیل تو اب بھی اپنی جگہ قائم ہے، جہاں تک بات سودا کے شعر میں تصرف کی ہے تو اپنی اس غلطی کو ہم نہ صرف یہ کہ کھلے دل سے تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس اصلاح پر ہم مولانا کے شکر گزار بھی ہیں، جب بات شعروں میں تصرف کی آ ہی گئی ہے تو لگے ہاتھوں ہم یہ بھی عرض کردیں کہ نومبر کے شمارے میں مولانا اسیدالحق صاحب نے حاصل مطالعہ میں ایک شعر نقل کیا تھا۔

کیا خبر یہ فشردۂ انگور
کتنا خوں ہو کے بادہ ہوتی ہے

اگر مولانا کاتب کے دامن میں پناہ نہ لیں تو اطلاعاً عرض ہے کہ یہ نشور واحدی کا شعر ہے اوراس میں ''بادہ ہوتی ہے'' نہیں بلکہ ''بادہ ہوتا ہے'' ہے، آخر میں بصد ادب عرض ہے کہ

تم اک قطرہ روک نہ پائے اشکوں کا
ہم آنکھوں میں دریا روکے بیٹھے ہیں

امجد گولڑوی صاحب کی تحریر ہم نے حیرت اور دلچسپی دونوں کے ساتھ پڑھی، امجد صاحب کی تحریر پڑھتے پڑھتے پتا نہیں کیوں برجستہ یہ شعر زبان پر آ گیا۔

مجھ سے وہ چھپ سکیں بھلا ایسے کہاں کے ہیں
جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں

امجد صاحب کے بقول مکرمی شکیل صاحب نے سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے عظیم بزرگ سیدنا عبدالواحد بن زید کی شخصیت پراگندہ کر کے اہل سنت کے جذبۂ عقیدت کو سخت ٹھیس پہونچائی ہے، اس پر عرض ہے کہ شکیل صاحب کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے بلکہ اس ''سخت ٹھیس'' کے اصل ذمہ دار تو امام شمس الدین ذہبی اور امام عبدالرحمٰن رازی ہیں جنہوں نے میزان الاعتدال اور الجرح والتعدیل میں حضرت عبدالواحد بن زید کے بارے میں الفاظ جرح ذکر کیے ہیں، شکیل صاحب تو محض ناقل ہیں، اس سلسلہ میں اصولی اعتبار سے ابھی مزید گفتگو کی گنجائش ہے، نیز یہ کہ زہّاد اور صوفیاء کا روایت حدیث کے سلسلہ میں جو موقف رہا ہے (**نکذب له لا علیه**) اس کو بھی امام مالک وغیرہ کے حوالے سے زیر بحث لایا جاسکتا ہے مگر ان مباحث سے ہم محض اس لیے صرف نظر کر رہے ہیں کہ کہیں پھر ''کسی کے جذبۂ عقیدت کو سخت ٹھیس نہ پہونچ جائے''. امجد صاحب کی اس تحقیق پر بھی قربان ہونے کو دل چاہتا ہے کہ ''اگر مذکورہ دونوں رواۃ پر جرح تسلیم کر بھی لی جائے تو اس حدیث کے درجۂ حسن تک پہونچنے میں کچھ شک نہیں، کیوں کہ اس معنیٰ کی حدیث سے صحاح وسنن اور جوامع ومسانید بھری پڑی ہیں'' غالبًا امجد صاحب نے ضعیف حدیث کو درجۂ حسن تک پہو چانے کے شرائط بغور ملاحظہ نہیں فرمائے، اور اس پر طرہ یہ کہ اس معنیٰ کی حدیث سے صحاح وسنن اور جوامع ومسانید بھری پڑی ہیں، پتا نہیں کہ ''اس معنیٰ'' سے محترم کی کیا مراد ہے؟ اگر مطلقاً ذکر الٰہی کی فضیلت مراد ہے تو صحاح وسنن ہی پر کیا موقوف ''اس معنیٰ'' کی تو بے شمار آیات خود قرآن کریم میں موجود ہیں، ہمیں حیرت ہے کہ جو حدیث درجۂ حسن تک پہونچی ہوئی ہو اور اس کے ہم معنیٰ احادیث سے صحاح وسنن بھری پڑی ہوں آخر وہ حدیث اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی جیسے وسیع النظر محدث کی نگاہ میں کیوں نہیں آئی اور انہوں نے لفظ عاشق کے سلسلہ میں اسکو ورود شرعی کیوں تسلیم نہیں کیا؟؟ اس سوال کا سوائے اس کے اور کوئی جواب نہیں ہے کہ اس حدیث کے بارے میں فاضل بریلوی کا بھی وہی موقف تھا جو شکیل صاحب نے حلیۃ الاولیاء کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ **هٰذا الحدیث خارج من جملة الاحادیث المراسیل المقبولة عن الحسن**۔

اس مرتبہ ''حاصل مطالعہ'' کے کالم میں مولانا منظر الاسلام صاحب کی مختصر مگر تحقیقی تحریر پڑھنے کو ملی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام اعظم پر مرجئی ہونے کا الزام بے بنیاد ہے، مولانا نے اس الزام کو بے بنیاد ثابت کرنے کیلئے امام اہلسنت امام ابوالحسن اشعری، امام بخاری، اور امام بیہقی جیسے جلیل القدر ائمہ کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ ایک حنفی ہونے کے باوجود ہمیں پسند نہیں آیا، یہاں اس بات کا ذکر بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ حضور غوث پاک نے (بر سبیل صحت نسبت) اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں ''مرجئیہ'' کے جو فرقے شمار کیئے ہیں ان میں ایک فرقہ حنفیہ بھی شمار کیا ہے، اس کو اکثر غیر مقلدین دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں، اس سلسلہ میں بیہقی وقت مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے اپنی مشہور کتاب **الرفع و التکمیل فی الجرح و التعدیل** میں بڑی محققانہ بحث کی ہے، اور قوی دلائل سے اس الزام کو بے بنیاد ثابت کیا ہے۔

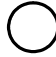
جناب ظہیر غازی پوری، ڈاکٹر شمیم ہاشمی، ڈاکٹر صابر سنبھلی، اور جناب شیدا بستوی کی منظومات پسند آئیں۔ شیدا صاحب کا ایک مصرع قابل غور ہے......ع

زندگی بھر ہے کیا جس نے اطاعت ان کی

یہاں حیدر آباد میں تو ''اطاعت کی جاتی ہے''، ممکن ہے بستی میں ''اطاعت کیا جاتا ہو''۔



مئی ۲۰۰۶ء



اپریل کا جام نور زینت نگاہ ہے، اس شمارے کو ادارہ نے ''ناموس رسالت کے نام '' کیا ہے، یوں تو حقیقت میں جام نور کا اجرا اور اس کی ساری جدو جہد ناموس رسالت کے تحفظ ہی کے لیے ہے، مگر موجودہ حالات کے تناظر میں یہ خصوصی شمارہ اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے، سرورق سے ہی اس شمارے کی اہمیت اور اس کے موضوع کا پتا چلتا ہے، حسب سابق سرورق پر شمارے کے اہم مضامین کی سرخیاں بڑے خوبصورت انداز میں لکھی گئی ہیں، ایک سرخی پر نگاہ رک گئی، ''مغرب میں آزادیٔ اظہار کا دھرا پیمانہ'' اگرچہ ''دوہرا'' اور ''دُہرا'' دونوں مستعمل ہیں (فیروز اللغات) مگر اس کو دو چشمی ھ سے (دھرا یا دوھرا) لکھنا بہر حال اردو کے مروجہ رسم الخط کی رو سے محل نظر ہے، جام نور جیسے ذمہ دار رسالہ کو رسم الخط کی ان باریکیوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے، یہی سرخی اس بار اداریہ کا عنوان بھی ہے، پانچ صفحات کا اداریہ معلوماتی، فکرانگیز اور وقیع ہے، ''آزادیٔ اظہار کا آئینی مفہوم'' اور ''احترام مذاہب کے بین الاقوامی قوانین'' کی ذیلی سرخیوں کے تحت مدیر اعلیٰ نے جو معلومات فراہم کی ہے وہ ان کے وسیع مطالعہ کی آئینہ دار ہے، توہین آمیز کارٹون کی اشاعت کے حقیقی مقاصد کا پتا لگانے کے لیے خوشتر صاحب نے ''شیلاند پوستین'' کے چیف ایڈیٹر فلیمنگ روز کے ایک مضمون کے حوالے سے جو انکشاف کیا ہے وہ مغرب کی اسلام دشمن ذہنیت کو آشکارا کرتا ہے، اداریہ کی آخری پانچ سطور بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مغرب کی جانب سے آئے دن اس قسم کی حرکتیں کیوں کی جاتی ہیں اور ان کے پیچھے کیا سازش کارفرما ہے- جام نور کے مستقل قلم کار مولانا اسید الحق قادری کا مضمون ''ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام'' پس منظر و پیش منظر کے کالم کی زینت ہے، مضمون ہم نے دلچسپی سے پڑھا، اجتہاد و تقلید کی تفہیم کے لیے اس قسم کے مضامین وقت کی ایک اہم ضرورت ہیں، ہمیں امید ہے کہ اپنی کم علمی اور سطحی مطالعہ کی وجہ سے مجتہدین پر ترک حدیث

کا الزام لگانے والے حضرات اس مضمون کو پڑھ کر اپنی رائے پر نظر ثانی کرینگے۔

حالات حاضرہ کے کالم میں اس مرتبہ خوشتر صاحب نے نیا تجربہ کر ڈالا، یوں بھی وہ نئی نئی زمینوں پر ''طبع آزمائی'' کرنے کے ماہر ہیں، انہوں نے آج کے سلگتے ہوئے موضوع پر ایک ''مجلس مذاکرہ'' منعقد کی جس میں تین دانشوروں نے ''احتجاج کیوں اور کیسے'' کے عنوان سے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا، مذاکرہ دلچسپ ہے، یہ الگ بات ہے کہ محترم اعظمی صاحب اپنی عمر اور آواز دونوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجلس پر چھائے رہے۔.بہر حال اس کالم کا یہ نیا انداز ہمیں پسند آیا، ہم امید کرتے ہیں کہ قارئین نے بھی اس مذاکرہ کو پسند کیا ہوگا اور آئندہ بھی خوشتر صاحب اس قسم کی علمی وفکری مجالس کا انعقاد کرتے رہیں گے۔

''شخصیات اسلام'' کے کالم میں محترم صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری صاحب کا مضمون ''توہین آمیز خاکے مسلم امہ کے لیے ایک خیر مستور'' شائع کیا گیا ہے، مضمون فی نفسہ عمدہ ہے مگر ''شخصیات اسلام'' کے کالم سے اس کی کوئی مطابقت ہماری سمجھ میں نہیں آئی، مضمون بغور پڑھنے کے بعد اس بات پر یقین کرنے میں ادنیٰ تأمل بھی نہیں رہتا کہ محترم صاحبزادہ صاحب ''ادارہ تحقیقات امام احمد رضا'' کے صدر ہیں۔

اس مرتبہ ''تحریری مباحثہ'' بھی کارٹون والے معاملہ سے متعلق ہے، مباحثہ کا عنوان ہے ''اسلام کے خلاف میڈیا کی جارحیت کا کیا جواب ہونا چاہیے؟'' اس میں مولانا یٰسین اختر مصباحی، مولانا منظر الاسلام ازہری اور ڈاکٹر امجد رضا امجد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، میڈیا کی جارحیت کے جواب میں تینوں حضرات نے سنجیدہ اور مؤثر ذرائع کی نشاندہی فرمائی ہے، ہمارے غائبانہ کرم فرما مولانا منظر ازہری صاحب کی تحریر ان کی فکری پختگی اور وسعت مطالعہ کی غماز ہے، البتہ زبان وبیان کی رو سے بعض جگہ کلام کیا جا سکتا ہے، مگر ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں کہ بلا وجہ پھر منظر صاحب کو ''تعقبات'' لکھنے کی زحمت کرنا پڑے گی، ڈاکٹر امجد صاحب کی تحریر بھی ہمیں پسند آئی محترم نے میڈیا پر صیہونی گرفت کے سلسلہ میں جو تفصیلات نقل فرمائی ہیں وہ حیرت انگیز ہیں، اس سلسلہ میں اگرچہ انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے مگر چونکہ وہ ایک ذمہ دار اور صاحب تحقیق قلم کار ہیں اس لیے ہمیں یقین ہے کہ

انھوں نے مذکورہ تفصیلات کسی معتبر اور مستند ماخذ سے ہی حاصل کی ہونگی۔

''اظہار خیالات'' کے کالم میں بھی کارٹون کا مسئلہ چھایا ہوا ہے، حضرت پروفیسر طلحہ رضوی برق صاحب، حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی صاحب، اور ہمارے کرم فرما مولانا کوکب نورانی صاحب نے مختلف گوشوں سے اسی مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے، حضرت برق صاحب نے تحریر کے آخر میں جو شعر نقل کیا ہے اس کے پہلے مصرع کو کمپوزر نے ''زخمی'' کر دیا ہے، صحیح مصرع یہ ہے:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

مولانا ملک الظفر صاحب نے مولانا اسید الحق قادری کے متنازع مضمون ''حدیث افتراق امت'' کے بحث طلب گوشوں پر کچھ لکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے، ہم ان کی اس تحریر کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں، ممکن ہے کہ اس تحریر کے جواب میں صاحب مضمون مہر سکوت توڑیں اور عام لوگوں کی تشویش اور ذہنی خلجان کا ازالہ ہو، جناب نعیم برکاتی صاحب نے ہماری کچھ معروضات (خامہ تلاشی، اکتوبر) پر کشادہ قلبی کے ساتھ غور کیا ہے، اس پر خوشی ہوئی، وہ فرماتے ہیں کہ ''اس کالم (خامہ تلاشی) کی جانب اب تک تو میں یہ سوچ کر بالکل توجہ نہیں دیتا تھا کہ اس میں تو سوائے تنقید کے کچھ نہیں ہوتا'' ان کے اس ''حسن ظن'' کا ہمیں کوئی گلہ نہیں ہے۔

''روبرو'' کے کالم میں اس مرتبہ محترم ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی صاحب سے ملاقات ہوئی، اگر خوشتر صاحب نے ان کو ''عبقریت کی صفت سے متصف کیا ہے'' تو ہمارے خیال میں کوئی غلط نہیں کیا، اس پر (بقول خوشتر صاحب) اگر کچھ جبینیں شکن آلود ہو کر ان کی عقیدت کو مورد الزام ٹھہرائیں تو یہ ان کی مرضی، مگر کم از کم وہ شخص جو سید صاحب کی تحقیقی اور فکر انگیز تحریریں پڑھ چکا ہو یا ان کی علمی مجلس سے استفادہ کر چکا ہو وہ تو خوشتر صاحب کی تائید ہی کریگا، دور کیوں جائیں خود ان کا زیر نظر انٹرویو ان کی گہری فکر اور ہمہ جہت معلومات پر شاہد عدل ہے، پہلے سوال کے جواب میں سید صاحب نے ایک جگہ فرمایا ہے ''ھٰذہ بدعتنا ردت الینا'' اور قوسین میں اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے ''یہ علم ہمارا ہی ایجاد کردہ ہے

جسے ہمیں دوبارہ دیا گیا''، غالبًا سید صاحب نے **ھٰذہ بضاعتنا** کہا ہوگا جس کو غلطی سے **بدعتنا** سمجھ لیا گیا اور پھر ترجمہ بھی **بدعتنا** کا کر دیا گیا، خوشتر صاحب نے سوال کیا کہ ''مستشرقین کی ریشہ دوانیوں کے رد عمل میں علماے اسلام نے جو کچھ کیا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟'' اس کے جواب میں سید صاحب فرماتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں اب تک کوئی خاص کام نہیں ہوسکا'' ہمارے خیال میں سید صاحب نے یہ بات صرف برصغیر کے علما کے بارے میں کہی ہے ورنہ سید صاحب ہم سے زیادہ واقف ہونگے کہ پچھلے ۵۰، ۶۰ برسوں میں عالم عرب اور بالخصوص مصر وغیرہ میں استشر اق اور مستشرقین پر وسیع پیمانے پر جو کام ہوا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہمیں جام نور کے ایک قاری کا خط موصول ہوا ہے، اس میں دیگر باتوں کے علاوہ ایک اہم سوال یہ ہے کہ گزشتہ ایک سال میں آپ نے جام نور کے ہر قلم کار اور ہر کالم کا تنقیدی جائزہ لیا ہے مگر آخر مفتی آل مصطفیٰ صاحب سے آپ کے ایسے کون سے خصوصی تعلقات ہیں جس کے نتیجہ میں ''شرعی عدالت'' کے ساتھ یہ رعایت برتی جارہی ہے کہ آج تک اس پر ایک حرف بھی نہیں لکھا گیا؟ اس پر عرض ہے کہ اولاً تو خامہ تلاشی لکھتے وقت کسی قسم کے تعلقات آڑے نہیں آتے اگر ایسا ہوتا تو شاید ہم کبھی اداریہ پر اتنا کھل کر تنقید نہیں کر پاتے کیوں کہ خوشتر صاحب سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کچھ اسی قسم کی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ شرعی عدالت میں سوالات کے بالکل درست جوابات دیے جاتے ہیں، اور خواہ مخواہ کی تنقید کرنا نہ ہماری عادت ہے اور نہ ہی خامہ تلاشی کا یہ مقصد ہے، ہاں البتہ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ دو تین مرتبہ ہمیں شرعی عدالت کے بعض مندرجات پر الجھن ضرور ہوئی مگر ہم نے اپنی اس ''الجھن'' کا اس لیے اظہار نہیں کیا کہ کہیں مفتی صاحب ہماری ''الجھنوں کا ازالہ'' کرنے کے درپے نہ ہوجائیں۔

''دیوان عام'' کے کالم میں اس بار دو مضامین ہیں، ایک سیدہ یاسمین زیدی صاحبہ کا اور دوسرا جناب شوکت علی صاحب کا، پہلا مضمون اصلاحی ہے جب کہ دوسرا فکری، ماہ صفر کے سلسلہ میں ہمارے یہاں جو توہمات پائے جاتے ہیں اس پر محترمہ یاسمین صاحبہ نے اچھا

مضمون لکھا ہے، مضمون کا عنوان ہے ''کیا صفر کا مہینہ منحوس ہوتا ہے؟'' جناب شوکت علی صاحب نے ''اقوام متحدہ اوراس کی ذیلی تنظیموں کے بڑھتے ہوئے اثرات'' کے موضوع پر معلوماتی مضمون لکھا ہے۔

حاصل مطالعہ کے کالم میں مولانا سلمان رضا ازہری نے ''مولانا ناصرالدین البانی اورحدیث رسول کی تضعیف'' کے عنوان سے تحقیقی مضمون لکھا ہے،البانی صاحب احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں بڑے متشدد واقع ہوئے تھے بالخصوص وہ احادیث جوحضوراکرم ﷺ کے فضائل، یاتوسل وزیارت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ایسی احادیث کوضعیف یاموضوع قرار دینے میں البانی صاحب نے ایڑی چوٹی کا زورلگا دیا ہے،انہوں نے ایک کارنامہ یہ انجام دیا کہ کتب سنن (ابوداود،ترمذی،نسائی،ابن ماجہ) کوصحیح اورضعیف دوحصوں میں تقسیم کردیا ہے مثلاً صحیح ترمذی،ضعیف ترمذی،صحیح ابن ماجہ،ضعیف ابن ماجہ وغیرہ،حالانکہ ان کتب کی جن احادیث کوالبانی صاحب نے ضعیف قرار دیا ہے،وہ احادیث محققین کے نزدیک صحیح یا متابعات وشواہد کی وجہ سے حسن ہیں،البانی صاحب کی تحقیق وتخریج میں بے شمار تضاد ہیں،کسی راوی کوایک جگہ ثقہ کہتے ہیں تو اسی کو دوسری جگہ متروک قرار دیدیتے ہیں،کسی حدیث کوایک علت کی بنیاد پرضعیف کہتے ہیں تو دوسری جگہ کسی حدیث میں اس علت کے باوجود حدیث کوحسن مان لیتے ہیں،البانی صاحب کے انہیں تضادات اور تسامحات کے رد میں علما نے مستقل کتب تصنیف فرمائیں جن میں شیخ عبداللہ الحبشی کی التعقب **الحثیث علی من طعن فیماصح من الحدیث** ،شیخ محمد سعید ممدوح کی **تنبیہ المسلم الیٰ تعدی الالبانی علی صحیح مسلم** ،اورشیخ حبیب الرحمٰن اعظمی کی **الالبانی شذوذہ واخطاؤہ** قابل ذکر ہیں. یہاں ہم اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ جام نورنے جماعت کونوجوانوں کی ایک ایسی ٹیم سے متعارف کروایا ہے جوعلم حدیث،اصول حدیث اوررجال حدیث پر گہری نظر رکھتے ہیں اوران سے توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ لوگ اس خلا کو پر کرینگے جوعلوم حدیث کے سلسلہ میں پچھلی کئی دہائیوں سے جماعت میں محسوس کیا جارہا ہے،انہیں نوجوانوں میں مولانا سلمان ازہری بھی ہیں،موصوف کی

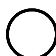
تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اچھا اور قلم پختہ ہے۔

منظومات کے کالم میں مولانا اسید الحق قادری کی ''حمدیہ نعت'' پڑھی، اس کے بارے میں خوشتر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بالکل نیا تجربہ ہے چلئے ہم بھی اس بات سے اتفاق کیے لیتے ہیں، البتہ اگر مولانا اس مصرع پر نظر ثانی کر لیں تو بہتر ہے ''قلم کو سرحد ادراک سے گزرنا ہے'' سہیل فصیحی صاحب کی تضمین بھی پسند آئی، اور جناب صغیر اختر مصباحی و مولانا سلطان رضا صاحب کی نعتیں بھی، جناب صغیر صاحب کا یہ مصرع محاورہ کی رو سے قابل غور ہے ''منظر کوئی کہیں کا نہ جچتا ہے سامنے'' مکرمی پروفیسر طلحہ رضوی برق صاحب کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے، فن اور زبان دونوں پر ان کی قدرت کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے، ان کی منقبت ان کی مہارت اور قادر الکلامی پر شاہد ہے، ان کے ایک مصرع پر نظر رک گئی ''شیر خدا علی کرم اللہ وجہہٗ''، ہماری ناقص معلومات کی حد تک کــــرّم کی را مشدد ہے، یا تو ہم اس مصرع کو صحیح طرح پڑھ نہیں پا رہے ہیں یا پھر حضرت برق نے کرّم کی را کسی عروضی قاعدہ کے تحت بجائے تشدید کے تخفیف کے ساتھ نظم کی ہے۔

خطوط کے کالم میں جناب محمد ناصر صاحب کا خط پڑھا اس کرم فرمائی پر ہم ان کے شکر گزار ہیں، اور ان کے ''مخاطبہ'' کا جواب دینے کی بجائے ''قالوا سلاماً'' پر عمل کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔



جون ۲۰۰۶ء



مئی کا شمارہ زینت نگاہ ہے، اداریہ اور خامہ تلاشی کے علاوہ سارے مشمولات ہم نے دلچسپی اور ذوق وشوق سے پڑھے اور پسند بھی آئے، محترم سید رکن الدین اصدق صاحب کا مضمون ''اسلام کا نظام امن'' پس منظر و پیش منظر کے کالم میں شائع کیا گیا ہے، مضمون معلوماتی ہے، اسلام کو جارح مذہب اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینا آج کے اسلام مخالف ذرائع ابلاغ کا پسندیدہ مشغلہ ہے، ساتھ ہی اسلام مخالف لابی کی طرف سے یہ پروپگنڈہ بھی کیا جاتا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ کافروں کو جہاں پاؤ قتل کردو، سید صاحب قبلہ نے ان افواہوں اور جھوٹے پروپگنڈوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے قرآن وسنت اور تاریخ اسلام کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ اسلام ہر حال میں امن وشانتی کا خواہاں ہے، لفظ ''کافر'' کے سلسلہ میں پیدا شدہ غلط فہمی کو بھی سید صاحب قبلہ نے دور کرنے کی کوشش کی ہے، واقعہ نگاری حضرت سید صاحب قبلہ کے قلم کا خاص وصف ہے، جس کی جلوہ سامانیاں اس مضمون میں بھی نظر آتی ہیں، اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''تاریخ ہجرت'' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، زبان پر حضرت کی گہری نظر ہے، اس لیے اگر انہوں نے اس مضمون میں ''ڈگر'' کو مذکر اور ''مندر'' کو مؤنث استعمال کیا ہے تو یقیناً ان کے پاس اس کی کوئی معقول دلیل ضرور ہوگی جس تک ہماری نظر نہیں پہنچ پا رہی ہے۔

''حالات حاضرہ'' کے کالم میں مولانا ذیشان احمد مصباحی کا دلچسپ مضمون ''شب جائے کہ من بودم'' شائع کیا گیا ہے، یہ مضمون دراصل دنیا کی بدلتی ہوئی صورت حال، اسلام کے امکانات اور اس کو درپیش خطرات پر ایک مذاکرے پر مبنی ہے، جو ذیشان صاحب کی ''مجلس احباب'' یا بالفاظ دیگر ''شعبۂ وقت گذاری'' کے زیر اہتمام ''منعقد'' ہوا تھا، اس قسم کے شعبوں میں عموماً ''نشستند، گفتند، برخاستند'' کے زریں اصول پر عمل کیا جاتا ہے، مگر ذیشان صاحب نے روایت توڑتے ہوئے برخاستند کے بعد ''نوشتند'' پر بھی عمل کر ڈالا،

مذاکرہ دلچسپ ہے، مگر آخر میں قاری کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے، اس گفتگو سے کوئی صحیح نتیجہ اخذ کر کے قارئین کی الجھن دور کرنے کی بجائے ذیشان صاحب نے یہ ذمہ داری الٹی قارئین کے کاندھے پر ڈال دی ہے کہ وہ اس مذاکرے سے کسی اچھے نتیجہ پر پہونچیں تو ذیشان صاحب کو مطلع کر دیں وہ ممنون ہونگے۔

''شخصیات اسلام'' کے کالم میں اس مرتبہ جناب عبدالستار طاہر صاحب نے علامہ نور بخش توکلی صاحب علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات کا تعارف کروایا ہے، یہ بھی جام نور کی ایک خاصیت ہے کہ اس نے شخصیات اسلام کے تحت عموماً ان اکابر اہل سنت کے تعارف پر توجہ دی ہے جن کی شخصیات وخدمات کو فراموش کر دیا گیا ہے، اسلام وسنیت کے لیے علامہ توکلی صاحب کی خدمات بڑی قابل قدر ہیں، اس عمدہ تعارفی مضمون کے لیے ہم جناب عبدالستار طاہر صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، جناب طاہر صاحب کے بقول علامہ توکلی علیہ الرحمہ کی ولادت ۱۸۷۷ء میں ہوئی، ۱۸۹۳ء میں وہ ہندو محمڈن اسکول انبالہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے، پھر ۱۸۹۶ء میں وہ میونسپل بورڈ کالج امرتسر میں پروفیسر مقرر ہوئے، اس معلومات کے لیے انہوں علامہ عبدالحکیم شرف قادری صاحب اور محترم پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کا حوالہ دیا ہے، ہمیں نہ ان حوالوں کی صحت پر شبہ ہے، نہ علامہ توکلی کے علم وفضل سے انکار ہے، اور نہ ہی ہم محترم طاہر صاحب کی علمی امانت ودیانت کے بارے میں مشکوک ہیں مگر اس کے باوجود ہم نے جب ان باتوں کو اصول درایت کی کسوٹی پر پرکھا تو ہمیں یکے بعد دیگرے کئی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑا، جب علامہ توکلی صاحب کی ولادت ۱۸۷۷ء میں ہوئی تو اس حساب سے ۱۸۹۳ء میں ان کی عمر ۱۶ سال کی تھی، اور یہ وہی سن ہے جب وہ ہیڈ ماسٹر مقرر کیے گئے، پھر صرف ۳ سال بعد ۱۸۹۶ء میں یعنی جب ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی تو وہ پروفیسر ہوگئے، یہ دونوں باتیں بجائے خود حیرت انگیز ہیں اور پھر علامہ صاحب نے ایم۔اے عربی بھی کیا تھا، جناب طاہر صاحب نے جس انداز میں ان کے ایم۔اے کرنے کا ذکر کیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ایم۔اے ہیڈ ماسٹر بننے سے پہلے کر لیا تھا، اگر یہ درست ہے تو یہ ہماری

تیسری حیرت ہے، کسی کا ۱۶ سال سے کم عمر میں ایم-اے کرنا کیا حیرت کی بات نہیں ہے؟ اور اگر علامہ صاحب نے ۱۸۹۶ء کے بعد ایم-اے کیا تو یہ ہماری چوتھی حیرت ہے کہ وہ پروفیسر پہلے بن گئے اور ایم-اے بعد میں کیا، خیر ہم یہاں حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہی عرض کریں گے کہ ہوسکتا ہے کہ جو باتیں آج ہمیں حیرت انگیز محسوس ہو رہی ہیں، اب سے ایک سو تیس سال قبل شاید وہ اتنی حیرت انگیز نہ ہوں، ممکن ہے اس دور میں نظام تعلیم، اور کالجوں کے اصول وضوابط اس بات کی اجازت دیتے ہوں کہ ایک آدمی ۱۶ سال سے کم عمر میں ایم.اے کر لے، ۱۶ سال کی عمر میں ہیڈ ماسٹر ہو جائے، اور ۱۹ سال کی عمر میں پروفیسر بن جائے، مگر اس حسن ظن کے باوجود ہماری حیرتوں کا سلسلہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا کیوں کہ علامہ توکلی صاحب کی بیعت وخلافت کے تذکرے میں جناب طاہر صاحب لکھتے ہیں کہ "۱۸۹۷ء میں تدریسی خدمات کے سلسلہ میں ہندو محمڈن اسکول انبالہ میں آپ کی بحیثیت ہیڈ ماسٹر تعیناتی ہوئی" ہماری پانچویں حیرت یہ ہے کہ گزشتہ بیان کے مطابق علامہ توکلی صاحب ۱۸۹۳ء میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے تھے مگر اس عبارت نے یہ انکشاف کیا کہ ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ان کی تقرری ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی، اب کس کو درست مانا جائے؟ اگر ۱۸۹۷ء میں ہیڈ ماسٹر بننے والی بات درست ہے تو ۱۸۹۶ء میں پروفیسر مقرر ہونے والی بات کا کیا بنے گا؟ ہماری چھٹی حیرت یہ ہے کہ جناب طاہر صاحب کے بقول علامہ توکلی کی ولادت ۱۳۰۵ ہجری مطابق ۱۸۷۷ عیسوی میں ہوئی تھی، مگر جب ہم نے مصر سے شائع شدہ ہجری عیسوی مطابقت تقویم میں دیکھا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ۱۳۰۵ ہجری ۱۸۷۷ عیسوی کے مطابق نہیں ہے، بلکہ ۱۳۰۵ ہجری ۱۹ ستمبر ۱۸۸۷ عیسوی میں شروع ہو کر ستمبر ۱۸۸۸ عیسوی میں ختم ہوئی ہے، ۱۳۰۵ ہجری مطابق ۱۸۷۷ عیسوی کا ٹھیکرا جام نور کے غریب کمپوزر کے سر بھی نہیں پھوڑا جا سکتا کیوں کہ اس سلسلہ میں جناب طاہر صاحب کا اصل ماخذ علامہ عبدالحکیم شرف قادری صاحب مدظلہ کی کتاب "تذکرہ اکابر اہل سنت" اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں بھی علامہ توکلی کی ولادت ۱۳۰۵ ہجری مطابق ۱۸۷۷ عیسوی ہی درج ہے (ص:۵۵۹، ناشر فیاض الحسن بک سیلر کانپور یو. پی

،انڈیا،سن ندارد)اگر ۱۳۰۵ ہجری کو علامہ توکلی صاحب کی سن ولادت مان لیا جائے تو ہماری ساتویں حیرت یہ ہوگی کہ توکلی صاحب دس سال سے کم عمر میں اپنے مرشد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے کیوں کہ طاہر صاحب کے مطابق توکلی صاحب کے مرشد گرامی حضرت توکل شاہ انبالوی علیہ الرحمہ کا وصال ۱۳۱۵ ہجری میں ہوگیا تھا،یعنی جس وقت توکلی صاحب کی عمر صرف دس سال تھی،حالانکہ خود طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ توکلی صاحب انبالہ میں ہیڈ ماسٹری کے دوران بیعت ہوئے تھے،تو کیا اب یہ سمجھا جائے کہ وہ دس سال سے بھی کم عمر میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے تھے؟؟؟ہماری ناقص رائے میں کہیں نہ کہیں تواریخ وسنین لکھنے میں تسامح ہوا ہے،اسی لیے یہ الجھنیں پیدا ہوگئیں ہیں،شاید ''الیواقیت المہریہ'' دیکھنے سے صحیح صورت حال سامنے آئے،یہ کتاب ہمارے پاس نہیں ہے،چونکہ محترم پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب نے بھی علامہ توکلی صاحب کے تعارف میں کافی لکھا ہے اس لیے ان الجھنوں کا ازالہ وہ زیادہ بہتر طریقہ سے کر سکتے ہیں۔

''اظہار خیالات'' کے کالم میں جناب ظفر نعمانی صاحب کی تحریر پڑھ کر یہ خوشگوار احساس ہوا کہ جام نور کے قارئین ذہن ودماغ حاضر اور آنکھیں کھلی رکھ کر جام نور کا مطالعہ کرتے ہیں اور اب کوئی بھی کسی پر خواہ مخواہ کی تنقید کر کے نہیں نکل سکتا۔محترم سید رکن الدین اصدق صاحب کی تحریر قابل غور ہے،ممکن ہے مولانا عبدالقادر رضوی صاحب سید صاحب کے ارشادات پر غور فرمائیں اور اپنے موقف کے دفاع میں کچھ تحریر فرمائیں،بڑوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں،یہ سید رکن الدین اصدق صاحب کا بڑپن ہے کہ وہ اس کم علم خامہ تلاش کو اپنی خامیاں تلاش کرنے کی دعوت دے رہے ہیں،یہی اعلیٰ ظرفی اگر آج ہمارے اندر پیدا ہوجائے تو ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل ایک آن میں حل ہوجائیں۔جناب فیصل مغیثی بغدادی صاحب شاید پہلی مرتبہ جام نور کی محفل میں تشریف لائے ہیں،ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں،محترم نے جام نور کے مستقل قلم کار مولانا اسید الحق بدایونی کے ایک مضمون پر کچھ علمی تنقیدیں فرمائی ہیں،جام نور ہر علمی اور سنجیدہ تنقید کو خوش آمدید کہتا ہے،ہمارے دوست خوشتر صاحب نے اس قضیہ میں ہم سے ''حکم'' بننے کی فرمائش کی ہے،مگر ہم اس کے

لیے معذرت خواہ ہیں، محترم بغدادی صاحب نے اِس غریب خامہ تلاش کی بھی اچھی خاصی ''خبر لی ہے'' اس کرم فرمائی پر ہم ان کے شکر گزار ہیں، ہمیں ان کی اس بات سے بھی کامل اتفاق ہے کہ واقعی ہماری ''جستجو کی استعداد کمزور'' ہے، یوسف قرضاوی کے تعارف والے معاملہ پر تو خوشتر صاحب نے ادارتی نوٹ میں تبصرہ کر ہی دیا ہے، عربی عبارتوں کے ترجمے یا ترجمانی کے سلسلہ میں مولانا اسید الحق قادری کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا جو موصوف نے آج سے دوسال قبل جام نور میں لکھا تھا، ''عربی اور اردو محاورات کا تقابلی جائزہ'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ ''دراصل سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کرنا بھی ایک فن ہے جو محض زبان کے قواعد رٹ لینے اور مفردات کو حفظ کر لینے سے نہیں آتا بلکہ اس کے لیے ذوق سلیم اور ادبی شعور بھی ضروری ہے، شاید اسی ذوق سلیم اور ادبی شعور کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں اگر ''**فقد قال زید**'' کا ترجمہ ''پس تحقیق کہ کہا زید نے'' نہ کیا جائے تو بعض ''کافیہ بردوش'' قسم کے علامہ چیں بجبیں ہو جاتے ہیں، اس قسم کے ترجمے اگر نحو وصرف کی کتابوں میں دی گئی مثالوں تک محدود رہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر حیرت اس وقت ہوتی ہے جب اسی قسم کے نحوی اور صرفی ترجمے عام مذہبی، ادبی اور تاریخی کتابوں میں روا رکھے جاتے ہیں''. (جام نور جولائی ۲۰۰۴ء ص ۱۰)

اس اقتباس سے ایسا لگتا ہے کہ کسی ''کافیہ بردوش علامہ'' سے سابقہ پڑنا مولانا اسید صاحب کے لیے کوئی نیا نہیں ہے بلکہ یہ ''حادثہ'' ان کے ساتھ پہلے بھی پیش آ چکا ہے، بغدادی صاحب نے اگر اپریل کا جام نور ملاحظہ فرمایا ہوگا تو اس میں مولانا اسید الحق کی یہ عبارت بھی پڑھی ہوگی کہ ''یہ ترجمہ لفظی اور حرفی نہیں ہے بلکہ سلیس اور آزاد ترجمہ ہے لہٰذا متن کے ہر ہر لفظ کا ترجمہ میں پایا جانا ضروری نہیں ہے''. اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عام طور پر کس قسم کا ترجمہ کرنے کے عادی ہیں، بغدادی صاحب ہماری مانیں یا نا مانیں لیکن اپنی ہی طرح کے ایک دوسرے فاضل بغداد کی بات شاید مان لیں، ''بدعت کا اسلامی مفہوم'' کے مترجم و محقق حضرت مولانا مختار حنیف قادری فاضل بغداد (شیخ الادب، دارالعلوم نور الحق، چرہ محمد پور فیض آباد) کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں ''میں نے

اس رسالہ کے ترجمہ میں حتی المقدور یہ کوشش کی ہے کہ مؤلف کا ذوق تحریر اور فتوی کی زبان برقرار رہے، دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ لفظی ترجمہ کی رعایت زیادہ کی گئی ہے، جب کہ مشہور ہے کہ مفہوم سے مفہوم کا تبادلہ و ترجمہ زیادہ بہتر اور آسان ہوتا ہے'' لیکن اس کے باوجود مترجم نے حسب ضرورت (مولانا اسید الحق کی طرح) ''لفظی ترجمے کی رعایت'' کا ذریں طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے، مثلاً ''بدیع السماوات والارض'' کے بعد ''یعنی'' کہہ کر جو لکھا گیا ہے وہ یہ ہے ''آسمانوں اور زمین کو کسی سابق نظیر کے بغیر پیدا فرمایا''، خدا جانے یہ ترجمہ ہے یا ترجمانی؟؟ ہماری ''جستجو کی استعداد کی کمزوری'' تو یہ بتا رہی ہے کہ ''پیدا فرمایا'' فعل ماضی کا ترجمہ ہے مگر ''اصل عربی عبارت'' میں ہمیں کوئی فعل ماضی تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا، مولانا اسید الحق کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے ''لفظی ترجمہ کی رعایت'' کی بجائے ''مفہوم سے مفہوم کا تبادلہ و ترجمہ'' اختیار کیا جو بقول مولانا مختار حنیف بغدادی صاحب ''زیادہ بہتر اور آسان ہوتا ہے''......ع......اتنی ذرا سی بات کا افسانہ کر دیا۔

مولانا منظر الاسلام ازہری اس بار ''حاصل مطالعہ'' کے کالم میں ''اہل رائے کی تشریح'' لے کر جلوہ افروز ہیں، مضمون مختصر مگر جامع ہے، ایک عبارت پر ہماری نگاہ رک گئی ''حافظ بوصیری نے ضعف کا حکم لگاتے ہوئے ''مصباح الزجاجہ'' کہا ہے'' الفاظ جرح میں آج تک ہم نے ''مصباح الزجاجہ'' نہیں پڑھا ہے اس لیے جب ہم نے اصل کتاب کی طرف رجوع کیا تو اس میں یہ عبارت ملی:

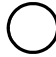
''والشھاب البوصیری الحافظ یعدہ فی ''مصباح الزجاجۃ'' ضعیفاً''

(فقہ اھل العراق وحدیثھم: صفحہ ۲۳)

ترجمہ غالباً یہ ہوگا کہ ''حافظ بوصیری نے ان کو اپنی کتاب مصباح الزجاجہ میں ضعیف قرار دیا ہے'' منظومات میں صابر جوہری کی صنعت توشیح پسند آئی، ہاں ابتدا میں ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ حسب سابق اس بار بھی اداریہ قابل مطالعہ ہے۔

❑❑❑

جولائی ۲۰۰۶ء



جون کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، ہم نے پورا شمارہ بڑے غور اور دلچسپی سے پڑھا، خامہ تلاشی شروع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ جو کچھ بھی لکھیں احتیاط سے لکھیں اور اگر کہیں کسی سے کوئی تسامح ہو جائے تو اگلے ہی شمارے میں اس کی طرف توجہ بھی دلا دی جائے، بڑے افسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ خامہ تلاشی اپنے مقصد میں اس حد تک کامیاب ہوئی ہے کہ لوگوں نے غلطیاں کرنا چھوڑ دیں، اس سے ہمارے لیے ایک دشواری یہ پیدا ہو گئی کہ جب لوگ غلطیاں ہی نہیں کریں گے تو پھر ہم آخر خامہ تلاشی میں کیا لکھیں گے؟ اب یا تو ہم خوشتر صاحب سے درخواست کریں گے کہ اس کالم ہی کو بند کر دیا جائے یا پھر اہل قلم سے گزارش ہے کہ آپ حضرات اتنے محتاط نہ ہوں، کہیں کہیں علمی، تاریخی، تحقیقی اور لسانی غلطیاں کرتے رہیں تاکہ ہمارا یہ کالم چلتا رہے۔

اس مرتبہ اداریہ کچھ زیادہ ہی مختصر ہے، اداریہ کا عنوان ہے ''فکر و نظر کی کشمکش'' خوشتر صاحب جس الجھن کا شکار ہیں، شاید وہ الجھن ملت کے تمام حساس اور باشعور افراد کو پریشان کر رہی ہوگی، مگر لوگ اس کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ہم کب تک آئے دن اسلام پر ہونے والے حملوں کے جواب میں زبانی، قلمی اور عملی احتجاج کرتے رہیں گے؟ آخر اس مشکل کا کوئی پائیدار حل ہے یا نہیں؟ اس اداریہ کے تناظر میں اس مسئلہ پر اس زاویہ سے غور کریں کہ آخر ہندستانی عدالتوں یا میڈیا میں ہر ایک دو ماہ بعد مسلم پرسنل لا سے متعلق کوئی مسئلہ کیوں اٹھایا جاتا ہے؟ ہماری ناقص رائے میں یہ ایک خطرناک اور گہری سازش کا حصہ ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ جب آج سے ۲۰ سال قبل شاہ بانو کیس کے نام پر مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی گئی تھی تو اس کے خلاف تمام اسلامیان ہند نے کس قسم کے رد عمل کا مظاہرہ کیا تھا؟ یہ ملک گیر احتجاج کچھ اتنا مؤثر ثابت ہوا تھا کہ اس وقت کی کانگریس حکومت پارلیمنٹ میں بل لانے پر مجبور ہو گئی تھی، جب اسلام دشمنوں نے دیکھا کہ اس طرح بیک

جنبش قلم ''یکساں سول کوڈ'' کے نفاذ کا خواب پورا نہیں ہوگا تو انھوں نے اپنا طریقۂ کار بدل دیا، اب یہ طے پایا کہ وقفہ وقفہ سے عدالت کے ذریعہ یا میڈیا کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کے متعلق مسائل اٹھائے جائیں، ایک عام مسلمان ایک بار احتجاج کرے گا، دو بار، تین بار، چار بار وہ آخر کب تک اپنے قائدین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے احتجاج کرنے کے لیے سڑکوں پر آئے گا، زندگی کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں، آخر کار ایک نہ ایک دن وہ تھک کر بیٹھ جائے گا اور ''کامن سول کوڈ'' کے نفاذ کا خواب دیکھنے والے اسی دن کا انتظار کر رہے ہیں، جس دن یہ نوبت آئے گی- آپ یقین کریں وہی دن ہندستان میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا دن ہوگا، کیوں کہ ہم اس وقت تک مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں مظاہرے اور احتجاج کرتے کرتے اکتا چکے ہوں گے، آپ دیکھ لیں کہ شاہ بانو کیس اور عارف گڑیا، یا عمرانہ، یا نجمہ کیس میں بیس سال کا فرق ہے اور ان بیس سالوں میں ہمارے اندر اتنی تبدیلی آچکی ہے کہ ہم جس طرح شاہ بانو کیس کے وقت بے چین ہوگئے تھے، جس طرح ہم نے احتجاج کیا تھا اور جس طرح ہمارے احتجاج کو سنجیدگی اور خوف کے ملے جلے تأثرات کے ساتھ دیکھا گیا تھا، کیا عارف، گڑیا کیس کے وقت بھی ہم نے جذبات کا مظاہرہ کیا تھا؟ کیا عمرانہ کے معاملہ کو ہم نے اتنی سنجیدگی سے لیا تھا؟ اور کیا اب شیر محمد بنام نجمہ کیس کے سلسلہ میں ہم کچھ فکر مند ہیں؟؟ بلکہ ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ اس وقت تمام اسلامیان ہند شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں متفقہ اور متحدہ موقف رکھتے تھے مگر آج ان مسائل کو لے کر خود ہماری صفوں میں شدید اختلاف رائے پایا جا رہا ہے، ایک مفتی جائز کہتا ہے تو کوئی عدم جواز کا فتویٰ دیتا ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ قدیم کا کچھ موقف ہے، جدید بورڈ کچھ کہہ رہا ہے، خواتین پرسنل لا بورڈ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے پر تلا ہوا ہے، تو شیعہ پرسنل لا بورڈ اپنی ڈفلی پر اپنا الگ راگ الاپ رہا ہے، ان مسائل کے سلسلہ میں ہم رفتہ رفتہ کچھ بے حس ہوتے جا رہے ہیں اور ایک عام آدمی ہر نئے معاملہ پر عدالت یا میڈیا کو کچھ کہنے کی بجائے الٹا سارا الزام علما، مفتیان کرام اور پرسنل لا بورڈوں کے سر ڈال کر اس معاملہ سے لاتعلقی کا اظہار کر دیتا ہے؟ یہ ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہے، لہٰذا ہمارے قائدین اور علما کو اس جنگ

کے لیے اپنی حکمت عملی پر ازسرنو غور کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں خوشتر صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے اس پر بھی غور ہوسکتا ہے، تجویز یہ ہے کہ اب ہم سب ملکر یہ مطالبہ کریں کہ پارلیمنٹ میں ایک ایسا بل پاس کروایا جائے کہ ''اگر آئندہ کبھی کوئی ہندستانی عدالت مسلم پرسنل لا کے خلاف فیصلہ سناتی ہے تو اس کو آئین ہند سے متصادم سمجھتے ہوئے کالعدم قرار دے دیا جائے گا، کیوں کہ آئین ہند میں مسلم پرسنل لا کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے''۔

پس منظر و پیش منظر کے کالم میں اس مرتبہ جناب متین عمادی صاحب کا طویل اور معلوماتی مضمون شائع کیا گیا ہے، عنوان ہے ''عظیم آباد کی ویران خانقاہیں'' جناب عمادی صاحب نے اس مضمون میں عظیم آباد (پٹنہ) کی چند ایسی خانقاہوں کا تعارف کروایا ہے جو اپنا وجود کھو چکی ہیں، اب صرف تاریخ کے اوراق میں ان کا نام یا ان کی نشانیاں باقی ہیں، مضمون ہمیں پسند آیا، مضمون کی زبان بھی صاف ستھری ہے البتہ اگر مولانا ملک الظفر سہسرامی صاحب کو بارِ خاطر نہ ہو تو ہم عرض کریں کہ یہ مضمون بعض ایسی تراکیب اور الفاظ سے پاک نہیں ہے جن کا استعمال عموماً ''اردو کے غیر ثقافتی'' علاقوں میں کیا جاتا ہے۔

''حالات حاضرہ'' کے کالم میں مولانا ذیشان احمد مصباحی نے ''میلاد النبی کی خوشیاں غم کی باعث کیوں؟'' کے عنوان سے قلم اٹھایا ہے، ہمارے لیے ان کی یہ تحریر ''غم کی باعث'' نہیں بلکہ ''خوشیوں کا باعث'' ثابت ہوئی، اس لیے کہ ''باعث'' مذکر ہے اور مذکر کے لیے ''کی'' نہیں بلکہ ''کا'' آتا ہے، ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نقشبندی مدظلہ کے حوالے سے ذیشان صاحب نے لکھا ہے کہ ''ابن تیمیہ بھی محافل میلاد منعقد کرنے والے مخلصین کی تائید کرتے ہوئے اجر و ثواب کی بشارت دیتے ہیں'' مکرمی ڈاکٹر صاحب نے اس کا کوئی نہ کوئی حوالہ ضرور دیا ہوگا اور یقیناً ابن تیمیہ نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں ایسا ضرور لکھا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ مجموعۂ فتاویٰ ابن تیمیہ میں گھنٹوں مغز ماری کرنے کے باوجود ہمیں جہاں بھی میلاد کا ذکر ملا تو ابن تیمیہ کا موقف اس کے خلاف ہی نظر آیا، بہر حال ہمارا نہ پانا نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

''شخصیات اسلام'' کے کالم میں اس مرتبہ بھی محترم محمد عبدالستار طاہر مسعودی صاحب

کا مختصر مگر جامع مضمون شائع کیا گیا ہے، یہ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کا تعارف ہے، مولانا کی تصانیف کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جناب طاہر صاحب نے گزشتہ شمارے میں جس شخصیت کا تعارف کروایا تھا، وہ صرف ۱۹ سال کی عمر میں پروفیسر کے عہدے تک پہونچ گئی تھی اور اس شمارے کی شخصیت نے ۱۹/سال میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے...... ع

ببیں تفاوتِ رہ کجاست تا بہ کجا

''لا ابالی پن'' کو مقام مدح میں استعمال ہوتے ہوئے ہم نے پہلی مرتبہ اسی مضمون میں دیکھا ہے۔

اظہار خیالات کے کالم میں مولانا کوکب نورانی صاحب کی تحریر ہم نے حزن وملال کے ساتھ پڑھی، اللہ تعالیٰ شہداء نشتر پارک کی مغفرت فرمائے۔ جناب فیصل مغیثی صاحب کے خلاف مولانا نعمان ازہری اور مولانا منظر الاسلام ازہری کی ''یلغار'' اس بات کا احساس کراتی ہے کہ کم ازکم جام نور میں تو کسی ازہری کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں ہے، بقول شخصے ''اس وقت ازہریوں نے جام نور کو یرغمال بنا رکھا ہے''۔ اس مرتبہ پھر مولانا منظر الاسلام ازہری نے اِس غریب ہیچ مداں پر کرم فرمایا ہے...... ع...... چشمِ ماروشن دلِ ماشاد

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہمارا مطالعہ محدود ہے، ہم پہلے بھی اس کا اعتراف کر چکے ہیں، اسی لیے ہم نے اپنے محدود اور ناقص مطالعہ پر اعتماد نہ کرتے ہوئے منظر صاحب کے مادر علمی الازہر الشریف میں شعبۂ حدیث کے استاذ حضرت ڈاکٹر احمد عمر ہاشم صاحب کے وسیع اور ''ازہری مطالعہ'' پر اعتماد کیا تھا، ڈاکٹر موصوف نے زیر بحث جملے کی نسبت کرامیہ کی طرف نہیں بلکہ اہل صلاح وتقویٰ اور صوفیہ وزہاد کی طرف ہی کی ہے اور اس کے لیے انہوں نے الباحث الحثیث کا حوالہ بھی دیا ہے، (السنة النبوية وعلومها: ڈاکٹر احمد عمر ہاشم ص: ۹۰، دار الکتاب الاسلامی، القاہرہ ۱۹۸۵ء) لہٰذا ہم نے بھی ان پر اعتماد کرتے ہوئے یہی بات لکھ دی تھی، اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کے ازہر کے اساتذہ کا ''مطالعہ اتنا محدود ہے کہ تدریب الراوی جیسی مشہور ومعروف کتاب بھی ان

کی نظر سے نہیں گزری''. جہاں تک بات صوفیہ کے وضع حدیث کی ہے تو اس سلسلہ میں ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ اس پر کچھ لکھنے میں یہ خطرہ ہے کہ بعض لوگوں کی عقیدت کو''سخت ٹھیس'' پہونچے گی، مگر جب منظر صاحب نے بات چھیڑ ہی دی ہے تو ہم صرف ایک اشارہ کر دینا چاہتے ہیں ،منظر صاحب چونکہ کافی وسیع المطالعہ ہیں لہٰذا باقی تحقیق وہ خود ہی کرلیں گے،ابن عراق الکنانی نے وضاعین کی اصناف شمار کرتے ہوئے الصنف الرابع میں زہاد اور متصوفہ کا ذکر کیا ہے(تنزیه الشریعة المرفوعه: ج ۱ ص: ۱۲ –دار الکتب العلمیه بیروت ۱۳۹۹ھ) یحیٰ بن سعید نے فرمایا'''ما رأیت الصالحین فی شیٔ اشد منهم فتنة فی الحدیث (الخطیب، الکفایة فی علم الروایة ص ۲۴۷) ابن صلاح فرماتے ہیں ''الوضاعون للحدیث اصناف،وأعظمهم ضرراً قوم من المنسوبین الی الزهد،ووضعوا الحدیث احتساباً فیما زعموا فتقبل الناس موضعاتهم ثقة منهم بهم''(مقدمة ابن الصلاح ص: ۹۸،دار الفکر المعاصر بیروت ۱۳۹۷ھ)

یہ صرف چند اشارات ہیں اگر منظر صاحب اس موضوع پر اپنا مطالعہ وسیع کرنے کے خواہش مند ہوں تو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں الاحادیث الموضوعه عند الصوفية از-ڈاکٹر محمد فؤاد شاکر القاہرہ- ویسے ہمارا مطالعہ تو محدود ہے ہی مگر اس کو ثابت کرنے کے لیے منظر صاحب نے جو دلائل دیے ہیں وہ ان کی وسعت مطالعہ کی دلیل ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ امجد گولڑوی صاحب نے فلاں فلاں غلطیاں کی ہیں اور چونکہ خامہ تلاش نے ان کی گرفت نہیں کی لہٰذا ثابت ہوا کہ خامہ تلاش کا مطالعہ محدود ہے،منظر صاحب چونکہ ایک ''وسیع المطالعہ ازہری'' ہیں لہٰذا اب انہیں کوئی کیوں کر سمجھا سکتا ہے کہ ہم نے صرف امجد صاحب ہی کی غلطیاں نظر انداز نہیں کیں بلکہ متعدد بار خود منظر صاحب کی بھی بہت سی فروگزاشتوں کو نظر انداز کرتے آئے ہیں،عبد الرحمٰن بن معاویہ والا قضیہ منظر صاحب کے حواس پر بری طرح چھایا ہوا ہے، خامہ تلاشی میں چونکہ گنجائش نہیں ہوتی اس لیے اگر خوشتر صاحب اجازت دیں تو ہم حاصل مطالعہ کے کالم میں اس روایت کا تحقیقی اور

تنقیدی تجزیہ کرنے کو تیار ہیں، منظر صاحب آئندہ کسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیں- مولانا اسید الحق صاحب کو اپنے ''خنجر تنقید'' سے زخمی کرنے کے بعد اب جناب فیصل مغیثی نے مولانا منظر از ہری کی طرف نشانہ سادھا ہے، انھوں نے منظر صاحب پر جو اعتراض کیا ہے اس کی طرف ہم اپریل کی خامہ تلاشی میں توجہ دلا چکے ہیں، لہٰذا اب اس اعتراض کے اعادے میں کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں یہ تو مغیثی صاحب ہی بتائیں گے، غالباً جناب مغیثی صاحب نے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کا مطالعہ نہیں فرمایا اور شاید نہ امام زاہد الکوثری کی کتاب ''**تانیب الخطیب علی ما ساقه فی ترجمة ابی حنیفه من الاکاذیب**''، محترم کے مطالعہ میں آئی ہے، ورنہ وہ خطیب بغدادی کو ''متعصب'' کہنے پر اتنا چراغ پانہ ہوتے- دوستیاں تو ہم نے بہت دیکھی ہیں مگر ایسی دوستی نہیں دیکھی جیسی فیصل مغیثی اور منظر صاحب کے درمیان ہے، مغیثی صاحب فرماتے ہیں کہ منظر صاحب سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں جب کہ اسی صفحہ پر منظر صاحب کا خط ہے جس میں انھوں نے مغیثی صاحب کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا ہے، مغیثی صاحب کی گزشتہ اور موجودہ دونوں تحریریں پڑھ کر بے ساختہ فانی کا مقطع یاد آ گیا-

رونے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں فانی
یہ ان کی گلی ہے ترا غم خانہ نہیں ہے

جناب سید حسین پیر قادری صاحب اور جناب نعیم صدیقی صاحب کی نعتیں پسند آئیں، سید صاحب کا ایک مصرعہ قابل توجہ ہے-

کہا سورج اشارے پر میں اس کے لوٹ آؤں گا

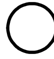
اس میں ''نے'' رہ گیا ہے جو وزن میں نہیں آ رہا ہے، نعیم صدیقی صاحب کا مصرع......ع

یہ اپنی نسبت عالی، یہ قسمتِ واژوں

اس کے لیے ہمیں لغات کشوری اور غیاث اللغات کی طرف رجوع کرنا پڑا تب کہیں جا کر ''واژوں'' کا مطلب سمجھ میں آیا-



اگست ۲۰۰۶ء



جولائی کا شمارہ میز پر ہے، دیدہ زیب، خوبصورت، اور حسن ظاہری و باطنی کا مرقع۔ اداریہ کا عنوان بڑا عجیب وغریب ہے جس کو سمجھنے کے لیے ہمیں خوشتر صاحب کو فون کرنا پڑا ''سیکولرائزیشن بنام اینٹی اسلامائزیشن''۔ اداریہ خلاف عادت ۷ صفحات پر مشتمل ہے، یہ اداریہ راجا رشید محمود صاحب کے اس تبصرہ کو تقویت دیتا ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے، لیکن یہ اداریہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ہم ان خطرات سے بے خبر نہیں ہیں بلکہ مسلسل اس کے دفاع اور مسلم معاشرہ کو فکری اور عملی مغلوبیت سے بچانے کی مہم میں مصروف ہیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرسوتی وندنا اور سرو دھرم سمبھاونا کی حمایت کرنے والے نام نہاد مسلم دانشور اسلامیان ہند کی غالب اکثریت کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ یہ صرف مٹھی بھر لوگ ہیں، جس طرح پاکستان میں نفاذ اسلام کی مخالفت پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت کا موقف نہیں ہے بلکہ یہ صرف چند مغرب زدہ لوگوں کا احساس کمتری ہے، ہمیں اس وضاحت کی ضرورت کیوں پڑی اس کا جواب قارئین کو آگے چل کر ملے گا، یہ اداریہ اپنے مواد، فکر، ترتیب، اور زبان وبیان کے اعتبار سے اتنا وقیع اور جامع ہے کہ اگر خوشتر برا نہ مانیں تو ہم عرض کریں کہ ایسا جامع اداریہ ایک عرصے کے بعد پڑھنے کو ملا ہے۔

''پس منظر و پیش منظر'' کے کالم میں مولانا منظر الاسلام ازہری صاحب کا گراں قدر تحقیقی مضمون زینت شمارہ ہے، موصوف گزشتہ ایک سال سے جام نور کے صفحات میں ہمارا علمی و تحقیقی محاسبہ کر رہے ہیں، ان کے ''تعقبات'' کو ہمیشہ ہم کشادہ قلبی سے خوش آمدید کہتے ہیں خواہ یہ تعقبات ''ہاضمہ کی درستگی'' کی خاطر ہی کیوں نہ لکھے گئے ہوں، اس کے باوجود ہم ان کی گہری نظر، وسعت مطالعہ اور تحقیقی مزاج کے معترف ہیں، زیر نظر مضمون ''یورپ وامریکہ کے ممالک دارالدعوہ ہیں'' منظر صاحب کے وسعت مطالعہ، اور مذاہب اربعہ پر ان کی باریک نظر کا منہ بولتا ثبوت ہے، مختلف ائمہ ومجتہدین کی آراء کا تحقیقی جائزہ

لینے کے بعد منظر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مذکورہ ممالک نہ ''دارالحرب'' کی فقہی اصطلاح کے تحت آتے ہیں، نہ ''دارالاسلام'' کا معنی ومفہوم ان پر منطبق ہوتا ہے اور نہ ہی ان کو شوافع کی اصطلاح ''دارالعہد'' کے تحت رکھا جا سکتا ہے، لہٰذا منظر صاحب نے خود اجتہاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ان ممالک کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع فرمائی ہے کہ یہ ممالک ''دارالدعوۃ'' ہیں، ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ان ممالک کے بارے میں بالکل یہی رائے مولانا وحیدالدین خاں نے بھی اپنی کسی کتاب میں ظاہر فرمائی ہے، جبکہ مصر کے ایک جلیل القدر عالم شیخ ابوزہرہ مرحوم نے بڑی تفصیلی بحث کر کے ان ممالک کو ''دارالعہد'' ثابت کیا ہے (**العلاقات الدولیۃ فی الاسلام**، از: شیخ ابوزہرہ صفحہ: ۶۰ دارالفکر العربی قاہرہ ۱۹۹۵ء)

ان ممالک کو دارالدعوۃ قرار دینے کے ساتھ ساتھ منظر صاحب نے ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ ان ممالک کی حکومتیں غیر مسلم حربی ہیں، خامہ تلاش جیسا ''محدود المطالعہ'' شخص اگر جان کی امان پائے تو اتنا پوچھنے کا حق تو ضرور رکھتا ہے کہ فقہاء اسلام نے غیر مسلموں کو تین اقسام میں بانٹا ہے، حربی، ذمی، مستامن، اب ان ممالک کے باشندے ان تین میں سے کس قسم کے تحت درج ہونگے؟ یا پھر ان کے لیے چوتھی اصطلاح ''مدعوین'' وضع کی جائے گی؟؟ کسی بھی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے اور اس کے باشندوں کے حربی ہونے کی بنیاد پر جو بے شمار مسائل متفرع ہوتے ہیں، دارالدعوۃ ہونے کی صورت میں ان مسائل کی نوعیت کیا ہوگی؟ مثلاً حربی سے عقود فاسدہ کے ذریعہ بھی مال حاصل کیا جاسکتا ہے، اب دارالدعوۃ میں وہاں کے غیر مسلم باشندوں سے اس قسم کے عقود کے ذریعہ مال حاصل کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ مسلک احناف پر دارالحرب میں جمعہ اور عیدین کا قیام بھی جائز نہیں ہے، دارالدعوۃ میں ان کے قیام کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ یہ اور اس قسم کے صدہا مسائل ابھی تحقیق طلب ہیں، بہرحال ہم منظر صاحب کی اس تحقیق کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

''حالات حاضرہ'' کے کالم میں ایک مرتبہ پھر مولانا ذیشان احمد مصباحی نے ایک اور فکر انگیز مضمون لکھ کر ہمیں اپنی فکری اور قلمی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا، مضمون

کاعنوان ہے ''اسلام اورعصر جدید''، چار صفحات پر مشتمل یہ مضمون معلوماتی اور فکر انگیز ہے، ایک مقام پر شیخ محمد بن عبداللہ نجدی لکھ گیا ہے جو غالبًا کمپوزنگ کی غلطی ہے محمد بن عبدالوہاب نجدی ہونا چاہیے۔سوئزرلینڈ میں یہودیوں کی کانفرنس کی سن ''۱۹۹۷ء'' لکھ گئی ہے یہ بھی غالبًا کمپوزر کے کھاتے میں جائیگی، کیوں کہ کانفرنس کی صحیح سن ۱۸۹۷ء ہے۔خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کی سن ذیشان صاحب نے ۱۹۲۳ء لکھی ہے، حالانکہ مارچ ۱۹۲۴ء میں سرکاری طور پر ادارت خلافت اسلامیہ کی برخاستگی کا اعلان کر کے آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبدالمجید دوم کو معزول کیا گیا۔لہٰذا ۱۹۲۳ء نہیں بلکہ ۱۹۲۴ء ہونا چاہیے۔

''شخصیات اسلام'' کے کالم میں اس مرتبہ مولانا شہباز عالم مصباحی صاحب نے بیسویں صدی کے معروف فقیہ ومحدث اور عاشق رسول علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی علیہ الرحمۃ کا تعارف کروایا ہے، مضمون مختصر مگر معلوماتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ علمی اور تحقیقی اسلوب کی بجائے افسانوی رنگ اختیار کیا گیا ہے جس میں عقیدت ومحبت کا عنصر غالب ہے، بہر حال ہم مولانا کی اس کاوش کی قدر کرتے ہیں اور جام نور میں پہلی مرتبہ شرکت کرنے پر ان کو خوش آمدید بھی کہتے ہیں.مولانا شہباز صاحب نے علامہ نبہانی کا نام یہ لکھا ہے ''یوسف بن اسماعیل بن یوسف بن اسماعیل بن محمد ناصرالدین نبہانی''اس سلسلہ میں ایک نام چھوٹ گیا ہے، محمد ناصرالدین سے پہلے حسن بھی ہونا چاہیے تھا یعنی یوسف بن اسماعیل بن حسن بن محمد ناصرالدین (**معجم المؤلفین**: عمر رضا کحالہ) شہباز صاحب لکھتے ہیں کہ (علامہ نبہانی نے) ''ایک قصیدہ **الرائیۃ الکبریٰ** سات سو پچاس اشعار پر مشتمل لکھا'' مذکورہ قصیدہ ہمارے پیش نظر ہے جس کا مطلع یہ ہے

بِـرَبِّـکَ ذَکِّرهُم عَسَیٰ تَنفَعُ الذِّکرَی

فَـکَـم نِـعَـمٍ أجـدَی وکَـم مِنَنٍ أجرَی

ہم نے جب اس قصیدے کے اشعار شمار کیے تو یہ انکشاف ہوا کہ اس کے اشعار کی تعداد سات سو پچاس نہیں بلکہ سات سو پچیس ہے۔شہباز صاحب نے علامہ نبہانی کے دوسرے قصیدے ''**الرائیۃ الصغریٰ**'' کا بھی ذکر کیا ہے، یہاں اس بات کا ذکر شاید بے محل

نہ ہو کہ اس قصیدے میں علامہ نبہانی نے اہل بدعت وہوا کے رد کے ذیل میں علامہ محمود شکری آلوسی (صاحب روح المعانی کے پوتے) کا بھی رد کیا تھا اس کا جواب شکری آلوسی نے ''**الآیۃ الکبریٰ علیٰ ضلالۃ النبھانی فی الرائیۃ الصغریٰ**'' کے نام سے دیا ، جب شکری آلوسی کا ذکر آہی گیا ہے تو ہم یہ بھی بتا دیں کہ علامہ نبہانی کی معرکہ آراء تصنیف ''**شواھد الحق فی الاستغاثۃ بسید الخلق**'' کے جواب میں شکری آلوسی نے دوجلدوں میں **نیل الامانی فی الرد علی النبھانی** تصنیف کی جس میں علامہ نبہانی کے علاوہ اجلۂ علمائے اہلسنت کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا، اور توسل واستغاثہ کے رد میں ایسا غلو کیا کہ بات انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء (علیہم الرحمۃ) کی تخفیف شان اور تنقیص وتوہین تک پہنچ گئی۔ شہباز صاحب نے علامہ نبہانی کی چند تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے جس میں ایک کتاب ''**الشرف المؤید**'' بھی ہے، یہ شاید کمپوزنگ کی غلطی ہے کتاب کا صحیح نام **الشرف المؤبّد**'' ہے، شہباز صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ نبہانی کی وفات ماہ رمضان کے آغاز میں ہوئی، یہ بات بھی توجہ طلب ہے، عمر رضا کحالہ نے آپ کی تاریخ وفات ''ریاض الجنۃ'' کے حوالے سے ۲۹ رمضان اور ''اعلام الادب والفن'' کے حوالے سے ۲۳ رمضان لکھی ہے (**معجم المؤلفین**: ج ۴، ص: ۱۴۵، مؤسستہ الرسالہ بیروت) ۲۳ یا ۲۹ دونوں میں سے جو بھی درست ہو بہر حال آغاز رمضان والی بات دونوں صورتوں میں صحیح نہیں ہوگی، ویسے مولانا شہباز عالم صاحب پر کوئی الزام نہیں ہے کیوں کہ انہوں نے جہاں سے یہ معلومات فراہم کی ہے اس کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ مضمون کے بعض جملوں پر بھی نظر رک گئی مثلاً ''بڑی دھنی قسمت لے کر آئے تھے''، ''آپ کا دل عشق رسول سے جل تھل تھا''، ''ایمان اور عشق رسالت میں چولی دامن کا رشتہ ہے'' (اس سے قطع نظر کہ محاورہ کی رو سے ''چولی دامن کا رشتہ'' نہیں بلکہ ''چولی دامن کا ساتھ'' زیادہ درست ہے) یہاں ایمان اور عشق رسالت جیسی تقدس مآب چیزوں کو چولی دامن کے رشتہ سے نتھی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے۔

''اظہار خیالات'' کے کالم میں اس مرتبہ حضرت مولانا بہاء المصطفیٰ صاحب اور مولانا

قاضی فضل احمد مصباحی صاحب نے مفتیٔ جام نور حضرت مولانا آل مصطفیٰ صاحب کے ایک فتوے پر تنقید کر کے ہماری طرف سے ''فرض کفایہ'' ادا کیا ہے، قاضی صاحب فقہ واصول فقہ اور فن افتاء میں گہری نظر رکھتے ہیں، جس کا اظہار ان کی موجودہ تحریر سے بھی ہو رہا ہے، ہم نہ سخن فہم ہیں نہ غالب کے طرف دار مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب کھیت کی تقسیم زید (دادا) کے انتقال کے بعد ہو رہی ہے جیسا کہ صورت مسئولہ سے ظاہر ہے تو پھر کھیت کو ۹۶ حصوں میں تقسیم کر کے ۱۶ حصے زید کو کیوں ملیں گے؟ ہماری ناقص فہم کے مطابق تو اب یہ مناسخہ کی صورت ہو گئی، لہٰذا قاضی صاحب کو مناسخہ کا عمل کر کے حصوں کی تقسیم کرنا چاہیے تھی۔

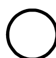
''جہان ادب'' میں ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب نے جناب راجا رشید محمود صاحب کی شاعری کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے، یہ بحث دراصل ''نعت رنگ'' کی ہے ہم خواہ مخواہ دخل در معقولات کے قائل نہیں ہیں مگر اب جبکہ یہ بحث جام نور میں آ ہی گئی ہے تو اس پر کچھ لکھنا ہمارا فرض بھی ہے اور حق بھی۔ قصہ یہ ہے کہ ''نعت رنگ'' (شمارہ ۱۵۔ مئی ۲۰۰۳ء) میں گوہر صاحب نے راجا رشید محمود کے ایک مجموعۂ کلام ''دیار نعت'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا تھا، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ''نعت رنگ'' نے صنف نعت پر علمی و فنی تنقید کے جو در وا کیے ہیں اس کے نتیجہ میں اس قسم کے تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اپنے اوپر سے علمی انداز میں تنقید کو رفع کرنا نہ صرف یہ کہ ہر شخص کا حق ہے بلکہ یہ بھی با مقصد اور مثبت تنقیدی عمل ہی کا ایک حصہ ہے لیکن اس کے جواب میں راجا صاحب نے جو مضمون لکھا (نعت رنگ شمارہ ۱۶۔ فروری ۲۰۰۴ء) اسے پڑھ کر ہمیں راجا صاحب سے اپنی عقیدت اور حسنِ ظن کو برقرار رکھنے میں خاصی دشواری ہو رہی ہے، راجا صاحب کو محترم صبیح رحمانی صاحب نے ''مملکتِ خدامِ نعت کے راجا'' کا خطاب دیا ہے، اس کے باوجود صبیح صاحب مذکورہ مضمون کے بارے میں اپنے اس تأثر کو نہیں چھپا سکے کہ ''راجا صاحب نے اپنے اس مضمون کو غیر تنقیدی زبان، طنزیہ لب و لہجہ اور غیر متعلق گفتگو سے خود ہی مجروح کر ڈالا ہے'' راجا صاحب کے اس مضمون میں آخر ایسی کیا بات تھی جس پر رحمانی صاحب جیسا سنجیدہ قلم

کار بھی یہ جملہ لکھنے سے خود کو نہیں روک سکا؟ اس سوال کے جواب میں ہم راجا صاحب کے قلمِ حق رقم سے نکلی ہوئی ان مہذب اور مثقف گالیوں کا اعادہ کر کے محترم گوہر صاحب کو ایک مرتبہ پھر ذہنی اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے، ان تمام دل آزار جملوں اور اہانت آمیز کلمات سے قطع نظر ہمیں سردست راجا صاحب کے اُس تبصرے پر تبصرہ کرنا ہے جس کی زد صرف گوہر صاحب پر ہی نہیں بلکہ تمام اسلامیان ہند پر براہ راست پڑتی ہے، راجا صاحب فرماتے ہیں ''اُپکار پسند ڈاکٹر گوہر جس طرح ہندوؤں اور ہندی کے زیر اثر معلوم ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ وہ عربی تلفظ کو غلط قرار دیتے - ہندو معاشرت، ہندوانہ تعلیم، اور ہندی پسندی کو لامحالہ یہی کچھ کرنا تھا - ہندستان کے بہت سے رہنے والے بہت حد تک مجبور اور کسی حد تک معذور نظر آتے ہیں کہ دینی شعائر اور اسلامی زبان سے اپنی مغائرت بلکہ مخاصمت کا ثبوت دیں - بدقسمتی سے وہاں کے کئی مسلمان اب تک متحدہ ہندستان کی راگنی الاپتے ہیں، ہندو خواتین سے شادیاں رچا بیٹھے ہیں، کچھ نے اپنی بیٹیاں ہندوؤں کو بیاہ دی ہیں اور ہندو معاشرت کا اٹوٹ انگ بن گئے ہیں'' ہمارے پیش نظر اخوت اسلامی کا آفاقی تصور ہے جس کی بنیاد پر ہم سرحدوں اور زبانوں کے تعصب کو ناپسند کرتے ہیں لہٰذا ہم جواب آں غزل کے رنگ میں ''مملکت خدام نعت کے راجا'' اور نعت کے موضوع پر دنیا میں سب سے زیادہ کام کرنے والے محترم رشید محمود صاحب سے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ اگر نعت کے ایک مصرع میں ایک ہندی لفظ (اُپکار) استعمال کرنا صرف اس بنیاد پر گردن زدنی جرم ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے تو کیا پنجابی انبیاء ومرسلین اور اہلِ جنت کی زبان ہے جس میں راجا صاحب نے تین مجموعہائے نعت لکھ کر ثواب دارین حاصل کیا ہے؟؟ اگر ہندستان کے غریب مسلمان ہندو معاشرت، ہندو سیاست اور ہندوانہ تعلیم کے اثر سے دینی شعائر سے مغائرت اور مخاصمت کرنے پر مجبور ہیں تو ان کی مجبوری تو سمجھ میں آتی ہے مگر مملکت خداداد کے ان ''خالص مسلمانوں'' کی کیا مجبوری ہے جو نظام اسلام اور حدود شریعت کے نفاذ کی شب و روز مخالفت کر کے مغربی طرز زندگی، مغربی نظام تعلیم اور مغربی نظام حکومت کے نفاذ کی راہ میں ''خالص

اسلامی جہاد'' کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں؟ آخر اسلام کے یہ علم بردار کس معاشرت، کس سیاست اور کس تعلیم سے متأثر ہیں؟ ہندو عورتوں سے شادیاں رچانا اور اپنی بیٹیاں ہندوؤں کو بیاہ دینا ان لوگوں کی سیاسی مجبوری ہوسکتی ہے جو متحدہ ہندستان کی راگنی الاپتے ہیں اور ہندو معاشرت کا اٹوٹ انگ بن چکے ہیں مگر اسلامی حکومت میں رہنے والے اسلام کے ان سرفروش جیالوں کی کون سی مجبوری ہے جو مغرب کی یہودی عورتوں سے بیاہ رچا کر اپنی عشرت گاہوں کو زینت بخش رہے ہیں؟ ہم یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلامی جمہوریت کی خالص اسلامی حکومت کے سرکاری ٹی.وی چینل پر اسلام کی عفت مآب اور'' خالص اسلامی معاشرت'' کے زیر اثر پروان چڑھنے والی پاک باز دوشیزائیں ثقافت اور کلچر کے نام پر جن ''فنونِ لطیفہ'' کا مظاہرہ کر رہی ہیں انہوں نے پاکستان کی کس اسلامی درسگاہ میں ان کی تعلیم حاصل کی ہے؟؟ راجا صاحب معاف فرمائیں ہم ان سے دست بستہ انہیں کے الفاظ میں وہی التجا کریں گے جو انہوں نے محترم ڈاکٹر شمیم گوہر صاحب سے کی ہے کہ ''ازراہ کرم شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر نہ پھینکیں'' -ایک غیر جانبدار ناقد کی حیثیت سے ہم اس بات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ جام نور کے موجودہ شمارے میں ڈاکٹر گوہر صاحب نے راجا صاحب کے مجموعۂ کلام ''احرام نعت'' پر جو تنقیدیں کی ہیں ان میں بہت سے اعتراض ایسے ہیں جن کے جواب میں راجا صاحب کے دفاع میں دلائل دیے جا سکتے ہیں مثلاً حیثیت، عوالم، اِسرا، حجیت، اور پلیٹ فارم وغیرہ، محترم گوہر صاحب ان پر نظر ثانی فرمالیں-''ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی'' پر اس مرتبہ پھر تبصرہ رہا جاتا ہے، خیر آئندہ شمارے میں سہی-



ستمبر۲۰۰۶ء



اگست کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، یہ شمارہ بھی اپنے مشمولات کے معیار اور انفرادیت کے اعتبار سے جام نور کی سابقہ روایتوں کا علم بردار ہے- خوشتر صاحب اس بار کسی وجہ سے اداریہ نہیں لکھ سکے لہٰذا یہ ذمہ داری ذیشان صاحب کو نبھانا پڑی- اداریہ میں خوشتر کی بجائے ذیشان کا نام دیکھ کر ہم نے ''خلاف عادت'' سب سے پہلے اداریہ پڑھنا شروع کیا، اداریہ کا عنوان ہے ''عالم اسلام میں بیک وقت خوف کے سائے اور امید کی کرنیں''- ذیشان صاحب کی صلاحیتوں کے ہم پہلے سے معترف ہیں، یہ اداریہ بھی عالمی سطح پر ملت کو درپیش مسائل پر ان کی گہری نظر کا ثبوت ہے- وقتی اور دائمی سوچ، تاریخ کے چند اوراق، مابعد جنگ افغان وعراق اور عالم اسلام کی عمومی ذہنیت، ان ذیلی سرخیوں کے تحت ذیشان صاحب نے چار صفحات میں امت اسلامیہ اور عالم اسلام کے ماضی، حال اور مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کی ہے، ذیشان صاحب کی اس تحریر نے ہمیں اطمینان کی بجائے اضطراب میں مبتلا کر دیا- ذیلی سرخی ''تاریخ کے چند اوراق'' میں کارل مارکس، اشتراکی نظام، ہندستان میں انگریزوں کی آمد اور ہماری جنگ آزادی کا ذکر، ان باتوں کا اداریہ کے مرکزی خیال سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوگا اور یقیناً ان سے کچھ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ ہم ان نتائج تک رسائی حاصل نہ کر سکے- ذیشان صاحب نے لکھا ہے کہ ''گاندھی جی کے ہاتھ میں بندوق نہیں بلکہ ایک لکڑی کا ڈنڈا ہوا کرتا تھا'' آج تک جتنے ڈنڈوں سے ہمارا سابقہ پڑا ہے وہ سب لکڑی ہی کے تھے ممکن ہے ذیشان صاحب نے کچھ ایسے ڈنڈے بھی دیکھے ہوں جو لکڑی کے علاوہ کسی اور چیز کے بنے ہوئے ہوں، اسی لیے انہوں نے گاندھی جی کے ڈنڈے کے ساتھ لکڑی کی قید ضروری سمجھی- ذیشان صاحب کا اداریہ فکر، مواد، زبان وبیان اور ترتیب کے اعتبار سے معلوماتی اور قابل مطالعہ ہے ''مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''، ہمیں امید ہے کہ اگلے شمارے میں خوشتر

اس بار کا کفارہ ادا کریں گے۔

''پس منظر و پیش منظر'' میں مولانا اسید الحق صاحب کا مضمون ''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ'' شائع کیا گیا ہے، یہ مضمون کی پہلی قسط ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبًا یہ مضمون بھی طویل ہے، اس کی ساری قسطوں کا مطالعہ کیے بغیر اس مضمون پر کوئی تبصرہ کرنا قبل از وقت ہوگا، مولانا کے بقول اس طریقۂ تفسیر کے غالی مؤیدین بھی ہیں اور انتہا پسند معارضین بھی، اب دیکھنا ہے کہ مولانا کا اپنا موقف کیا ہے؟ مضمون میں ایک جگہ ''قفص'' کو ص سے (قفص) لکھا گیا ہے، غالبًا یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے یا ممکن ہے کہ مصر میں قفس ''ص'' سے ہی لکھا جاتا ہو، ویسے ہماری ناقص معلومات کی حد تک اردو میں قفس ''س'' سے لکھا جاتا ہے۔ (فیروز اللغات)

''شخصیات اسلام'' کے کالم میں جناب عبد الوحید صاحب نے ''ابن سینا: ڈاکٹروں کے ڈاکٹر'' کے عنوان سے ابن سینا پر مختصر مگر معلوماتی مضمون لکھا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض نگاہیں ''پردۂ زنگاری'' کے اندر چھپے ہوئے ''معشوق'' کا نہ صرف نظارہ کر لیتی ہیں بلکہ اس کے خدوخال کی شناخت بھی کر لیتی ہیں، ہمیں امید ہے کہ جناب عبد الوحید صاحب آئندہ کوئی مضمون تحریر کریں گے تو آخر میں اس کے ماخذ کا حوالہ بھی دے دیں گے، یہ علمی امانت کا تقاضا بھی ہے اور تحقیقی منہج کا لازمہ بھی۔ مضمون میں زبان و بیان کے تسامحات سے قطع نظر اس جملہ پر ہماری نظر رک گئی ''ایک وقت وہ بھی آیا کہ ارسطو اور افلاطون کے آزادانہ ترجمہ نے ابن سینا کی تخلیقی تھیوری کو منظر عام پر لایا جس کا تعلق تخلیق کائنات کے تصور سے ہے'' اس عبارت کا معنی یا تو ہم نہیں سمجھ پا رہے ہیں یا پھر مضمون نگار نے بغیر سمجھے لکھ دیا ہے۔ مضمون کی آخری عبارت بھی توجہ طلب ہے ''وہ (ابن سینا) ایک خدا پرست تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کا فلسفہ عہد رفتہ کے ملحدین سے مناسبت نہیں رکھتا وہ اپنے تشکیلی فلسفہ کو عقائد سے مدغم کرتے ہیں'' یہ عبارت بھی ہمارے لیے ناقابل فہم ہے، خاص کر ایسی صورت میں جب امام غزالی کی ''تهافة الفلاسفة'' اور شہرستانی کی کتاب ''الملل والنحل'' کی ''الفصل الرابع فی المتأخرین من فلاسفة الاسلام'' ہمارے پیش

نظر ہے- یہاں ہم ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، ابن سینا کے سوانح نگاروں نے عموماً یہی لکھا ہے کہ علم طب میں ان کا کوئی استاذ نہیں تھا، زیر نظر مضمون میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن بعض مستشرقین نے اور ان کی تقلید میں بعض دوسروں نے "ابو سہل عیسیٰ بن یحییٰ الجرجانی" کو علم طب میں ابن سینا کا استاذ ثابت کیا ہے، شاید ابو سہل الجرجانی کو یہ "اعزاز" اس لیے دیا گیا ہو کہ وہ ایک عیسائی عالم تھا-

"اظہار خیالات" کا کالم بھی دلچسپ ہے، گزشتہ شمارے میں مولانا قاضی فضل احمد صاحب اور حضرت مولانا بہاء المصطفیٰ صاحب نے حضرت مفتی آل مصطفیٰ صاحب کے ایک فتوے پر کچھ علمی تنقیدیں فرمائیں تھیں، اب مفتی صاحب کے دفاع میں شعبۂ تخصص فی الفقہ، جامعہ امجدیہ، گھوسی کے ہونہار طالب علم مولانا غلام رضا قادری صاحب میدان میں آئے ہیں، موصوف نے حقِ شاگردی ادا کرتے ہوئے مذکورہ دونوں ناقدین کی تنقید پر تنقید کی ہے، لیکن پتا نہیں کیوں انہوں نے مولانا بہاء المصطفیٰ صاحب کی تحریر کو متین وسنجیدہ اور قاضی فضل احمد صاحب کی تحریر کو غیر سنجیدہ قرار دیا ہے، ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جامعہ عربیہ ضیاء العلوم بنارس سے بھی شعبۂ تخصص فی الفقہ کا کوئی "ہونہار طالب علم" میدان میں آئے گا اور غلام رضا صاحب کی تحریر کا "ردِ بلیغ" کرے گا-

"روبرو" کے کالم میں معروف ادیب ونقاد اور ماہرِ عروض وقوافی ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی صاحب کا انٹرویو فردوس نظر ہے، اس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ......ع......

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

یہ انٹرویو ہم نے نہ صرف یہ کہ بڑے غور سے پڑھا، بلکہ اس کے ممکنہ عواقب ونتائج پر بھی غور کیا اور اب تک غور کر رہے ہیں، مطلع ابر آلود ہے، "سر مونڈاتے ہی اولے پڑنے" اور "اس عاشقی میں عزت سادات جانے" کا صدفی صد امکان ہے، لہٰذا ہم اس پر کچھ تبصرہ کرنے کی بجائے اس پر اہل علم کی رائے کا انتظار کر رہے ہیں-

سنتے ہیں بپا ہوگا یہیں فتنۂ محشر
بیٹھے ہیں سرِ راہ گزر دیکھنے والے

''جہانِ ادب'' کے کالم میں ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب کی تحریر زینت شمارہ ہے،موصوف نے جناب عزیزاحسن کراچی کی کتاب ''نعت کی تخلیقی سچائیاں'' کے دیباچہ بعنوان ''زبان خامہ ندارد سرِ بیانِ فراق'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے. یہ تنقیدی جائزہ خود ایک تنقیدی جائزے کا متقاضی ہے، یہ تحریر تین صفحات پر مشتمل ہے،جس میں ڈیڑھ صفحہ صرف تمہید کی نذر ہو گیا ہے، باقی کے ڈیڑھ صفحے میں تنقیدی جائزہ ہے،تنقیدی جائزے کے لیے گوہر صاحب نے دیباچے کی صرف چار عبارتوں کا انتخاب فرمایا ہے، دوعبارتیں صفحہ۱۰ سے اور دو صفحہ ۱۱ سے،صفحہ ۱۰ کی جو دو عبارتیں گوہر صاحب نے نقل فرمائی ہیں وہ صرف ایک ایک جملے پر مشتمل ہیں- پہلی عبارت یا جملہ یہ ہے''دنیائے نعت میں ایسے شعرا کی اکثریت ہے جو تخلیق نعت کو کوئی سنجیدہ ادبی سرگرمی تسلیم ہی نہیں کرتے'' کم علمی کے باعث ہماری سمجھ میں نہ یہ عبارت آسکی اور نہ ہی اس عبارت پر محترم گوہر صاحب کا تنقیدی جائزہ- عزیز احسن صاحب کی دوسری عبارت جس کو محترم گوہر صاحب نے تنقیدی جائزے کے لیے منتخب فرمایا ہے وہ یہ ہے ''میں نعت کو تنقید سے بالاتر صنف سخن تسلیم کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوں'' اس عبارت پر محترم گوہر صاحب نے جو تنقید فرمائی ہے وہ ہمارے ناقص خیال میں محض ''برائے وزنِ شعر'' ہے- تیسری عبارت جو قدرے طویل ہے (یعنی گزشتہ عبارتوں کی طرح صرف ایک جملے کی نہیں ہے بلکہ پانچ جملوں پر مشتمل ہے)اس میں بھی ہمیں کوئی خاص قابلِ تنقید بات نظر نہیں آئی، ہاں اگر ہم کسی عبارت پر تنقید کرنے کی قسم ہی کھالیں تو بات دوسری ہے- چوتھی عبارت کا تنقیدی جائزہ بھی بس محض برائے تنقید ہے-

''دیوان عام'' کے کالم میں جون کے شمارے سے رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا ایک نایاب اور دلچسپ انٹرویو ''ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی'' کے عنوان سے شائع کیا جارہا ہے، یہ واقعی خاصہ کی چیز ہے،ہمیں اپنی اس کوتاہی کا پورا اعتراف ہے کہ جگہ کی قلت کے باعث گزشتہ دو شماروں میں ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکے، یہ انٹرویو کی تیسری قسط ہے،اس کی ہر قسط پہلے سے زیادہ دلچسپ ہے اور ہر قسط پڑھنے کے بعد اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے، یہ چونکہ ایک گفتگو ہے لہٰذا اس میں جو سادگی، برجستگی، بے تکلفی

اور پُر کاری ہے وہ اپنے اندر ایک الگ کشش رکھتی ہے، ''زلزلہ'' کا ادبی اور علمی اسلوب اپنی جگہ، ''لالہ زار'' کی شگفتگی، منظر کشی، حسنِ تعبیر اور دلگدازی مُسلّم، لیکن اگر علامہ صاحب اس انٹرویو کو اپنے قلم سے لکھتے تو شاید وہ لطف نہ آتا جو اس گفتگو میں آرہا ہے، انٹرویو کی زیر نظر قسط صرف ڈھائی صفحات پر مشتمل ہے، خوشتر صاحب سے درخواست ہے کہ ہمارا زیادہ امتحان نہ لیں اور اس انٹرویو کو زیادہ صفحات دیں۔

ہمارے کرم فرما مولانا منظر الاسلام ازہری کی تحقیقی اور انکشافی تحریر ''معجزۂ شق القمر: سائنس کا اعتراف'' حاصلِ مطالعہ کی زینت ہے، مولانا کو نئے نئے گوشے تلاش کر کے ان پر دادِ تحقیق دینے میں مہارت حاصل ہے، زیر نظر مضمون بھی قابل مطالعہ ہے، اس میں مولانا نے آیتِ انشقاق قمر کی تفسیر کے لیے علامہ ابوالحسین علی الماوَردی کی کتاب ''النکت والعیون فی التفسیر'' کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ ہی اس کو ''مطبوعہ بیروت'' بھی لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نایاب تفسیر چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے، یہ ہماری معلومات میں اضافہ ہے، کیوں کہ اب تک ہم اس تفسیر کو غیر مطبوعہ سمجھتے تھے، کاتب چلپی نے کشف الظنون میں اور امام سبکی نے طبقات الشافعیہ میں اس کا ذکر کیا ہے، مشہور مستشرق بروکالمین نے اس کے بعض قلمی نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ معجزۂ شق القمر کی احادیث کے بارے میں مولانا منظر صاحب فرماتے ہیں کہ ''راقم کی تحقیق کے مطابق اس مضمون کی حدیث چھ جلیل القدر صحابۂ کرام سے مروی ہے'' اب ظاہر ہے کہ منظر صاحب جیسے وسیع المطالعہ محقق کی اس ''ازہری تحقیق'' کے سامنے خامہ تلاش جیسا ''محدود المطالعہ'' لب کشائی کی جرأت کیسے کرسکتا ہے؟ ہاں! البتہ اس بات پر اظہار تعجب کا حق تو ہمیں ہے ہی کہ جو تحقیق منظر صاحب کی ہے بالکل وہی تحقیق حافظ ابن کثیر اور امام سیوطی کی بھی ہے، ان دونوں حضرات نے بھی اس معجزہ کے سلسلہ میں صرف چھ صحابہ کا ذکر کیا ہے (سیوطی: الدر المنثور ج:۷، صفحہ ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، دار الفکر بیروت ۱۹۹۳ء اور ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ ج:۳، ص:۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، مکتبۃ المعارف بیروت، سن ندارد) منظر صاحب تلاش و تحقیق جاری رکھیں ممکن ہے کہ ان چھ کے علاوہ اور بھی کچھ صحابہ کے اسماء

گرامی ان کو مل جائیں جن سے باسناد صحیحہ اس مضمون کی حدیث مروی ہے، اگر تلاش میں کامیابی نہ ہو تو اِس کم سواد ''محدود المطالعہ'' کو ضرور مطلع کریں ممکن ہے یہ اپنے ہندستانی مطالعہ کی روشنی میں ان کی کچھ مدد کر سکے اور چھ اسماء کی فہرست میں تین ناموں کا اور اضافہ ہو جائے۔

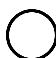
اس بار ہمارے ایک کرم فرما نے خامہ تلاش کی بھی ایک خامی تلاش لی، زیر نظر شمارے میں ہم نے کم از کم تین جگہ لفظ ''سن'' استعمال کیا ہے اور تینوں جگہ اس کو مؤنث استعمال کیا ہے، یعنی کانفرنس کی سن، خاتمہ کی سن وغیرہ، ان بزرگ کا کہنا ہے کہ اردو میں لفظ سن بطور مؤنث نہیں بلکہ مذکر استعمال ہوتا ہے لہٰذا کانفرنس کا سن، یا خاتمہ کا سن ہونا چاہیے۔ یوں تو کاتب کے دامن میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا مجرم بھی اس میں بآسانی پناہ لے سکتا ہے، مگر ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے سن کو مؤنث ہی لکھا تھا، اس سلسلہ میں ہماری اپنی کوئی تحقیق نہیں ہے اگر آپ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ مذکر ہے تو چلیے ہم بھی مذکر مانے لیتے ہیں۔ پیمائش کے کالم میں مولانا ذیشان صاحب نے ''نعت رنگ'' کے تازہ شمارے پر تبصرہ کیا ہے، اس تبصرے پر تبصرہ کرتے ہوئے کسی نے خوشتر صاحب سے کہا کہ ''اس کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ یا تو یہ ابوالفیض معینی نے لکھا ہے یا پھر خامہ تلاشی ذیشان صاحب لکھتے ہیں ''اس پر ہم حلف اٹھانے کو تیار ہیں کہ اس تبصرہ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ذیشان صاحب کے کچھ جملے ایسے برجستہ ہیں کہ بے ساختہ منھ سے سبحان اللہ نکل جاتا ہے ،اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ منظومات کے کالم میں محترم نسیم شاہ جہانپوری، قاری عبدالمتعال صاحب اور جناب غلام مصطفیٰ مجددی صاحب کی حمد، نعت، اور غزل شائع کی گئی ہیں۔ محترم نسیم صاحب کی حمد کا ایک مصرع ہے...... ؎ ''یہ کائنات ترا فن ہے اور تو فنکار'' اس سے پہلے کہ یہ مصرع کسی دارالافتاء میں پہونچے ہم محترم سے گزارش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''فنکار'' پر غور کر لیا جائے، ویسے نسیم صاحب کی غزل ہمیں پسند آئی۔ قاری عبدالمتعال صاحب کی حمد بھی اچھی ہے، ہاں اس شعر پر نظر رک گئی:

جذبۂ شوقِ کمالِ دید میں
طور و موسیٰ کی میں بھولا داستاں

یہ شعر تشریح طلب ہے۔ جناب غلام مصطفیٰ مجددی صاحب کی نعت پاک مرصع ہے ،البتہ یہ مصرع غور طلب ہے......ع......''حاضر وناظر ہوئے نظر وتصرف سے حضور'' اس سے قطع نظر کے مصرع میں ناظرض سے (ناضر) لکھا ہے ،نظر متحرک الاوسط استعمال ہوتا ہے ،جبکہ یہاں مصرع میں ساکن الاوسط زیادہ مناسب ہے ،اس کے علاوہ یہ مصرع الفاظ کی نشست کے اعتبار سے بھی محل نظر ہے ،مجددی صاحب کا ایک اور مصرع ہے ''ان کا روضہ میرے چشم شوق میں جلوہ طراز'' اس میں ''میرے چشم'' نہیں بلکہ ''میری چشم'' ہونا چاہیے ،یہ شاید کاتب کی مہربانی ہے۔ اس شمارے میں ہم نے مولانا ملک الظفر سہسرامی صاحب کی کمی شدت سے محسوس کی۔

❑❑❑

اکتوبر ۲۰۰۶ء



ستمبر کا جام نور ''پورب کی کسی نئی نویلی دلھنیا کی طرح ٹھمک ٹھمک چلتا ہوا'' ہمارے مطالعہ کی میز تک پہنچا۔ (قارئین کو اختیار ہے کہ پہلے والے ٹھمک کو چاہے ٹھمَّک پڑھیں یا ٹھمکَّ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا) سرورق کی دلکشی، مضامین کا حسن انتخاب، منظومات کا کالم، انٹرویو، مباحثہ اور خطوط کی ترتیب سب ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔

شکارِ ماہ کہ تسخیر آفتاب کروں
کسے میں ترک کروں کس کا انتخاب کروں

لیکن اداریہ میں اس بار خوشتر نے قلم توڑ دیا ہے، اداریہ کا عنوان ہے ''دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا'' ۶ صفحات پر مشتمل اداریہ ہم نے بغور پڑھا اور کئی بار پڑھا، انتہائی معلوماتی، فکری اور حقائق کو اجاگر کرنے والے اس اداریے پر ہم مدیر محترم کو مبارکباد دیتے ہیں، اداریے میں ''دہشت گرد صرف مسلمان نہیں'' کے عنوان سے دہشت گردی کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے مدیر محترم نے جن حقائق کے رخ سے پردہ ہٹایا ہے وہ چشمِ عبرت سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اسی طرح انہوں نے ''اہل تصوف'' اور ''اہل توہب'' کے درمیان فکر اور مزاج کے اعتبار سے فرق پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے، مدیر محترم کو ہم مشورہ دیں گے کہ اس اداریہ کا انگریزی اور ہندی ترجمہ کر کے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کروادیں تاکہ ہماری بات ان حلقوں تک بھی پہنچے جو اسلام، جہاد اور دہشت گردی کے سلسلہ میں غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ اداریہ میں ایک سے زیادہ بار لفظ ''وحدانیت'' استعمال کیا گیا ہے مثلاً ''عبدالوہاب نجدی نے خالص وحدانیت کے نام پر'' ہماری ناقص رائے میں جہاں جہاں وحدانیت استعمال کیا گیا ہے ان سب مقامات پر لفظ ''توحید'' ہونا چاہیے تھا۔

پس منظر و پیش منظر کے کالم میں مولانا اسید الحق صاحب کے مضمون ''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ'' کی دوسری قسط شائع کی گئی ہے، لیکن اس قسط کے آخر میں

بھی ''جاری ہے'' لکھا ہے اس کا مطلب ہے کہ یہ آخری قسط نہیں ہے بلکہ ابھی اس مضمون کی اور بھی قسطیں باقی ہیں، اس قسط میں مولانا نے ان علما کی رائے اور دلائل پر روشنی ڈالی ہے جو قرآن اور سائنس کی مطابقت کو درست نہیں مانتے، ان علما کا کہنا ہے کہ قرآن کریم انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے نہ کہ اس لیے کہ اس سے طبیعات اور فلکیات کے مسائل کا استخراج کیا جائے، اس کے علاوہ یہ حضرات یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ سائنسی نظریات کو ثبات وقرار نہیں ہے آج کچھ ہیں اور کل کچھ، اگر قرآن اور سائنس کی تطبیق کا دروازہ کھول دیا گیا تو یہ دشواری ہو جائیگی کہ ایک سائنسی نظریے کو آپ نے آج قرآن کے مطابق ثابت کر دکھایا اور اگر اگلے کچھ سالوں میں وہ نظریہ غلط ثابت ہو گیا تو پھر آپ کیا کریں گے؟ سائنسی تفسیر کے مخالفین کا یہ اعتراض اپنے اندر کافی وزن رکھتا ہے، اس کے جواب میں مولانا اسید صاحب کا کیا موقف ہے یہ تو آئندہ قسطوں میں ہی معلوم ہوگا۔

حالات حاضرہ کے تحت مولانا ذیشان احمد مصباحی کی تحریر ''عالم اسلام میں بیداری مخالف سرگرمیاں'' قابل مطالعہ ہے، پانچ ذیلی سرخیوں کے تحت ذیشان صاحب نے عالم اسلام کو درپیش فکری الجھن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، ''بیداری کے مفہوم سے بے خبری'' کے ذیل میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمیں دعوت فکر دے رہا ہے، اس کے علاوہ ''اتحاد امت کا خوش کن تصور'' اور ''بے جا فرقہ وارانہ تشدد'' کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی ہمارے خوابیدہ احساس کو جگانے کے لیے ایک تازیانہ ہے، ہمیں ذیشان صاحب کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ''یہ تسلیم کہ مسلمانوں پر بے حسی وغفلت کی چادر تنی ہوئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اب وہ چادر آہستہ آہستہ کھسک رہی ہے''۔ مولانا نے ''زمام'' کو مذکر استعمال کیا ہے، یہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے، تاہم اطلاعاً عرض ہے کہ لفظِ زمام اردو میں مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ''کم پڑھے تعلیم یافتہ'' کی ترکیب بھی ہمارے لیے نئی ہے۔

حضرت مولانا سید رکن الدین اصدق صاحب کا مضمون ''علامہ فضل حق خیرآبادی وفتوئ جہاد'' شخصیات اسلام کی زینت ہے، مضمون کے عنوان میں اگر ''و'' کی جگہ ''اور'' ہوتا

تو غالباً زیادہ بہتر ہوتا ۔حضرت سید صاحب قبلہ ایک شگفتہ قلم کے مالک ہیں، بالخصوص افسانوی اسلوب کو اپنی تحریر میں خوب برتتے ہیں، اور بڑی دلکشی سے برتتے ہیں، زیرِنظر مضمون میں بھی اس اسلوب کی بہاریں دیکھی جا سکتی ہیں، استاذ مطلق علامہ فضل حق خیرآبادی کے فتوئ جہاد، جنگ آزادی میں شرکت اور کالے پانی کی اسیری کے سلسلہ میں اگرچہ علامہ سے عقیدت و محبت رکھنے والوں نے بہت سے افسانے تراش لیے ہیں، تاہم آپ کا فتوئ جہاد ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ٦٠ کی دہائی میں امتیاز علی خاں عرشی اور معروف محقق مالک رام نے رضا لائبریری رامپور کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ایک خط کی بنیاد پر یہ شگوفہ چھوڑا تھا کہ علامہ خیرآبادی کا فتوئ جہاد یا جنگ آزادی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، علامہ سے مسلکی طور پر اختلاف رکھنے والے اہل قلم نے اس کو خوب ہوا دی، اور ''فضل حق خیرآبادی کا فتوئ جہاد حقیقت یا افسانہ'' جیسے عنوانات کی حامل کتابیں منظر عام پر آنے لگیں، کراچی سے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب نے اس کے جواب میں ''فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون'' جیسی تحقیقی کتاب لکھ کر مالک رام کے چھوڑے ہوئے شگوفے کا بھرپور جواب دیا ۔سید صاحب قبلہ کا زیرنظر مضمون ہمیں پسند آیا ،مضمون میں کئی جگہ کتابت کی غلطیاں راہ پا گئی ہیں، مثلاً ''کارتوس'' اور ''جھرمٹ'' کو مؤنث کمپوز کر دیا گیا ہے جب کہ یہ دونوں لفظ مذکر ہیں، اردو محاورے کی رو سے عام طور پر ''جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیلتی ہے'' لیکن اگر ''میرٹھ کی چھاونی میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیل گئی'' تو کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ محاوروں میں اتنا تصرف تو کیا ہی جا سکتا ہے، البتہ مضمون کا یہ جملہ ہماری آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھ رہا ہے کہ ''بادشاہ کی رہی سہی تکریم بھی ان کی آنکھوں میں کانٹا بن کر گڑنے لگی''۔

تحریری مباحثہ کے کالم کا عنوان ہے ''کیا مذہبی و تبلیغی سرگرمیوں کا موجودہ طریقہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے؟'' اس میں مولانا فیضان المصطفیٰ قادری صاحب اور مولانا ملک الظفر سہسرامی صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مولانا قادری صاحب کی تحریر ٹو دی پوائنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ مختصر بھی ہے، انہوں نے ہماری جماعت کے بعض

المیوں پر بڑی جرأت سے روشنی ڈالی ہے،اس کالم کی دوسری تحریر مولانا ملک الظفر صاحب کی ہے ،یہ پہلی تحریر کے مقابلے میں قدرے طویل اور تفصیلی ہے ،سہسرامی صاحب ایک ''لِکھاڑی'' آدمی ہیں،قلم کوروکتے روکتے بھی دوتین صفحے ہوہی جاتے ہیں،بہرحال ان کی تحریر بھی ہمیں پسند آئی۔

جہان ادب میں ''برق وشرر کی تابشیں''اس شمارے کا خاص تحفہ ہے ،محترم برق صاحب نے محترم شررصاحب کے گزشتہ انٹرویو پراظہار خیال فرمایاہے،شررصاحب قرض اورادھار کے قائل نہیں ہیں لہٰذا انہوں نے برق صاحب کے تبصرے پر نقد تبصرہ فرمادیا۔اس سے پہلے مدیراعلیٰ نے باکس میں ایک نوٹ بھی لگایاہے،نوٹ کے اس جملہ پر ہماری نظر رک گئی''ہم اہل علم کی بارگاہ میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ خالص علمی وتنقیدی مباحث کو ذاتیات سے نہ جوڑیں جس سے جماعت میں علمی شعور پروان چڑھنے کی بجائے ذاتی منافرت کی فضا ہموار ہونے لگے''خدا جانے خوشتر صاحب نے یہ جملہ برق صاحب کا خط پڑھنے کے بعد لکھاہے یا شرر صاحب کا تبصرہ پڑھ کر؟ بہرحال ہم نے ذوق وشوق اور دلچسپی سے دونوں تحریریں پڑھیں اور محظوظ ہوئے ،برق وشرر دونوں ہماری جماعت کی نہایت بلند قامت شخصیات ہیں،اور دونوں اپنی اپنی جگہ محترم بھی ،ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ان دونوں حضرات کے درمیان محاکمہ کریں ،برق وشرر کی تابشوں میں ہمارا حکم بن کر کچھ لب کشائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے امریکہ اور روس کے درمیان ایٹمی اختلاف کا تصفیہ کرنے کے لیے نیپال حکم بن کر اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈال لے۔

بریلی سے مولانا صغیر احمد صاحب اچانک اپنی ''تشویشیں'' لیے ہوئے نمودار ہوئے ہیں،عالم تصورات میں ہماری ملاقات مولانا سے ہوئی تو انہوں نے ہماری توجہ محترم شرر صاحب کے اس مکتوب کی طرف کرائی جو محترم نے حضرت اشرف میاں کو تحریر فرمایا ہے،مولانا صغیر صاحب نے ہم سے استفسار کیا کہ شرر صاحب نے اس میں ایک جگہ لفظ ''تاہنوز'' استعمال کیا ہے اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟ چونکہ یہ ازقسم استفسار تھا اس لیے ہم نے اس لفظ پر غور کیا اور ''ہنوز'' کر رہے ہیں،اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک

غیاث اللغات کی یہ عبارت ہماری سمجھ میں نہیں آ جاتی ''ہنوز بفتح اول وضم نون وواۓ معروف بمعنیٰ تاحال وتااکنوں وکسانے کہ تا ہنوز بزیادتِ تا گویند غلط است''۔چونکہ ہمارے سامنے شررصاحب کے مکتوب کی مطبوعہ کاپی ہے،لہٰذا ہم باور کیے لیتے ہیں کہ کاتب دیوبندی رہا ہوگا۔شررصاحب کے ذریعہ پیش کردہ ہندوپاک کے ''اہل نظر'' کی فہرست میں اگر بے چارے ابوالفیض معینی کا نام نہ آسکا تو اس پر ہمیں کوئی شکوہ نہیں ہاں البتہ ان ''خوش نصیبوں'' میں ہندستان سے محترم اشرف مارہروی اور پاکستان سے جناب کوکب نورانی کا نام تو آ ہی سکتا تھا۔

مولانا منظر الاسلام ازہری صاحب کی تحریر ''امریکیوں کا محبوب ترین شاعر رومی'' حاصل مطالعہ کی زینت ہے ،یہ دراصل ایک امریکن اخبار ''سان فرانسسکو کرانکل'' میں شائع شدہ ایک مضمون کا ترجمہ ہے،مضمون نگار کا نام تلاش بسیار کے باوجود ہمیں منظر صاحب کی تحریر میں نہیں مل سکا،ترکی کے شہر ''قونیہ'' کا جہاں بھی ذکر آیا ہے اس کو منظر صاحب نے ''کونیہ'' لکھا ہے،غالباً مضمون نگار نے اس کو Q سے لکھا ہوگا،جس سے منظر صاحب کو دھوکا ہوا۔مضمون کے اس جملے پر ہماری نگاہیں رک گئیں ''رومی کا خیال ہے کہ مذہب سے قطع نظر تمام انسان کا آپس میں ایک رشتہ ہے،وہ یہودی،عیسائی،ہندو اور بدھ کے ساتھ ساتھ دیگر تمام مذاہب کو خوش آمدید کہتے ہیں'' یہ جملہ پڑھ کر ہمیں خوشتر صاحب کا وہ اداریہ یاد آ گیا جو انھوں نے ''فکری ارتداد کی خطرناک مہم'' کے عنوان سے فیورک نامی تنظیم کے خلاف لکھا تھا۔

پیمائش کے کالم میں مولانا نیاز احمد مصباحی صاحب نے ڈاکٹر محمود حسین بریلوی صاحب کی کتاب پر عمدہ تبصرہ کیا ہے،گزشتہ دو تین سال کے اندر جماعت اہل سنت میں نوجوان اہل قلم کی جو ٹیم تیار ہوئی ہے (بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جام نور نے تیار کی ہے تو شاید غلط نہ ہو) مولانا نیاز صاحب بھی اسی ٹیم کے فرد ہیں اور خوب لکھتے ہیں،ان کا زیر نظر تبصرہ ان کی گہری تنقیدی نظر اور تحریری سلیقہ مندی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

الازہر انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ''مقابلۂ علوم حدیث'' کا اعلان

دیکھ کر مسرت ہوئی، لگتا ہے واقعی ہماری جماعت اب بیدار ہورہی ہے- پہلی مرتبہ منظومات کے کالم کو محترم شرر مصباحی صاحب نے زینت بخشی ہے، ان کی حمد اور رباعی اس کالم کے وقار اور وقعت کو دوبالا کررہی ہے، اس کالم میں مولانا سید بیکس نواز حسینی شارق کی نعت پاک بھی شامل ہے، نعت ہمیں پسند آئی، اس شعر پر ہماری نگاہ رک گئی:

ان کی نعلین کے سانچے سے ولی بنتے ہیں
اور قدم ان کے حقیقت کا پتہ دیتے ہیں

"نعلین کے سانچے" کی ترکیب محل نظر ہونے کے علاوہ اس شعر میں اجتماع ردیفین کا عیب بھی پیدا ہوگیا ہے- نعت کا ایک مصرع ہے-

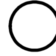
فرق عاشق و مسلماں کے عمل کا دیکھو

اس میں غالباً کتابت کی کوئی غلطی ہے کیونکہ موجودہ صورت میں مصرع بحر سے خارج ہے-

"آپ نے کہا" کے کالم میں ہم نے مولانا حضور احمد منظری صاحب کا خط دلچسپی سے پڑھا، ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ وہ "خامہ تلاشی" کو توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں-



نومبر۲۰۰۶ء



اکتوبر کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، دیدہ زیب سرورق دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے- اس مرتبہ اداریہ اپنے عنوان ہی کی طرح مختصر ہے، اداریے کا عنوان ہے ''مذہبی صحافت کا فسانہ''، اداریہ صرف تین صفحات پر مشتمل ہے جو جام نور کے اداریوں کی روایت کے خلاف ہے- سرورق پر اداریے کی سرخی کے ساتھ یہ سوال بھی درج کیا گیا ہے کہ ''کیا اسلام مخالف ہندی وانگریزی میڈیا کا جواب اردو کے اخبارات ورسائل ہیں؟'' پورا اداریہ اسی سوال کے اردگرد گھوم رہا ہے، ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے- تو اب اس اسلام مخالف پروپگنڈے کے جواب میں کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ اس سلسلے میں خوشتر صاحب نے جام نور کے چند احباب کے ساتھ مل کر ''اسلامی میڈیا سینٹر'' کا ایک جامع منصوبہ بنایا ہے، یہ منصوبہ کاغذ سے زمین پر اترنے کے لیے اکابرین ملت کی طرف آس لگائے دیکھ رہا ہے، یہ فیصلے کی گھڑی ہے، اداریے کا آخری جملہ ہمارے احساسات پر ایک تازیانہ ثابت ہوا اور ہم بہت دیر تک عظیم الشان جشنوں، جلسوں، اعراس اور بزرگان دین کے مزارات پر پیش کیے جانے والے زربفت غلافوں کی اہمیت، ضرورت، اور افادیت کا موازنہ اس منصوبے کی اہمیت وضرورت اور افادیت سے کرتے رہے، اور پھر جب ہم نے سابق الذکر امور پر صرف کیے جانے والے سالانہ بجٹ کا تخمینہ لگایا تو گھبرا کر سوچنے کا سلسلہ منقطع کر دینا پڑا، اسلامی میڈیا سینٹر کا قیام وقت کی ایسی اہم ضرورت ہے کہ اگر اس سمت میں فوراً کوئی پیش قدمی نہیں کی گئی تو آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی- یہ اداریہ پڑھ کر ہمارے بے شمار قارئین نے خوشتر کے زور قلم کی داد دی ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے زور قلم اور زیادہ کرنے کی دعاء بھی کی ہوگی، یا اگر کوئی زیادہ ہی جذباتی ہوگا تو وہ مسجع مقفیٰ جملوں سے مزین ایک تعریفی خط ارسال کرکے مطمئن ہو جائیگا، لیکن کیا صرف اتنا کرنے سے ہم نے اپنی ملی، اور جماعتی ذمہ داری نبھادی؟ کیا اتنا کرکے ہم اپنے واجب

سے عہدہ برآ ہو گئے؟؟ اور کیا محض اتنا کرنا ہی ہماری قوم، ملت اور جماعت کے سنہرے مستقبل کے لیے کافی ہے؟؟؟ اپنے دل کو ٹٹولیے اور اور اپنے احساس کو جگایئے، اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو یقین جانیے کہ ایسی ہی قوموں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

لیکن اگر ایک لمحے کو یہ خیال دل میں آئے کہ اس کے علاوہ بھی ہماری کچھ ذمہ داری بنتی ہے تو پھر اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ہمارے اس منصوبے پر غور کیجیے اور اس کو کاغذ سے زمین پر لانے کے لیے دامے درمے قدمے سخنے اپنا تعاون پیش کر کے آنے والی نسلوں کو اس اعتراف پر مجبور کر دیجیے کہ ہمارے بزرگ ایک باوقار، خود دار، غیور اور باحمیت قوم کے افراد تھے، جنہوں نے قوم کی سرخ روئی، بقاء، تحفظ اور استحکام کے لیے اپنی پونجی کا آخری سکہ، اپنے سینے کی آخری سانس اور اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر دیا۔
اداریے کے اس جملے پر نظر رک گئی ''دو برسوں سے قوس وقزح کے جو دھنک رنگ بکھرے ہیں''۔ اس سے قطع نظر کہ قوس اور قزح کے درمیان ''و'' زائد ہے، قوس قزح تو خود دھنک کو کہتے ہیں پھر ''قوس قزح کے دھنک رنگ'' کا کیا مطلب ہوا؟ اس کی وضاحت تو محترم مدیر صاحب ہی فرمائیں گے۔

''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ'' کی تیسری قسط زینت شمارہ ہے، گزشتہ خامہ تلاشی میں ہم نے جو سوال اٹھایا تھا براہ راست اس کا جواب دے کر شکوک وشبہات رفع کرنے کی بجائے مولانا اسید صاحب نے اس سوال کے جواب کے لیے اپنے ایک استاذ ڈاکٹر جمال مصطفیٰ صاحب کے دامن میں پناہ لی ہے، مگر ساتھ ہی جمال مصطفیٰ صاحب کے جواب کو ''**فیہ ما فیہ**'' کہہ کر ضعیف بھی قرار دے دیا ہے۔ سائنسی تفسیر کے جواز کے لیے جو شرائط اور قیود ذکر کی گئی ہیں ان سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔

حالات حاضرہ کے کالم میں مولانا ذیشان صاحب نے معروف عرب صحافی مرسی عطاء اللہ کی فکر انگیز تحریر کا ترجمہ پیش کیا ہے، مضمون کا عنوان ہے ''مابعد لبنان اسرائیل

جنگ''۔مرسی عطاءاللہ کا شمار عالم عرب کے ان مفکر صحافیوں میں ہوتا ہے جو مشرق وسطیٰ کے سیاسی حالات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں،ان کی فکری گہرائی اور تجزیہ نگاری کی صلاحیتوں کا اندازہ ان کی زیر نظر تحریر سے بھی ہو رہا ہے،ساتھ ہی ذیشان صاحب کا ترجمہ بھی قابل تعریف ہے،قاری کو کہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی تحریر کا ترجمہ پڑھ رہا ہے بلکہ یہ بجائے خود شگفتہ،سلیس،اور رواں دواں نثر کا بہترین نمونہ ہے۔البتہ بعض جگہ زبان و بیان کی معمولی غلطیاں راہ پا گئی ہیں مثلاً''یہ وہی بے سروپا کی باتیں ہیں''یہاں''کی''زائد ہے صرف''بے سروپا باتیں''ہونا چاہیے تھا۔''امریکہ کے اس دوہرا پیمانہ کے سبب''یہاں ''دوہرے پیمانے''چاہیے۔

شخصیات اسلام کے کالم میں محترم چاند نظامی صاحب نے''مجاہد آزادی مولانا امام بخش صہبائی''پر اچھا تعارفی مضمون لکھا ہے،مضمون میں مولانا آزاد کے والد کا نام''مولانا ابوالخیر''لکھا ہے حالانکہ ان کا نام مولانا خیر الدین تھا،مولانا صہبائی کے معاصرین کا تذکرہ کرتے ہوئے مضمون نگار نے ان کے معاصر علما اور شعرا کی الگ الگ فہرست درج کی ہے ،صدرالصدور مفتی صدرالدین آزردہ صاحب کا نام شعرا کی فہرست میں رکھا گیا ہے،اس میں کوئی شک نہیں کے شعروادب کے میدان میں بھی آزردہ کا مقام بہت بلند ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اس سے کہیں بڑے عالم تھے،لہٰذا ہمارے ناقص خیال میں علما کی صف زیادہ مستحق ہے کہ اس میں آزردہ کا شمار کیا جائے،بہر حال مضمون ہمیں پسند آیا۔

اس مرتبہ تحریری مباحثے کے لیے ایک بہت حساس اور نازک موضوع منتخب کیا گیا ہے،مباحثے کا عنوان ہے''امام احمد رضا محدث بریلوی کے ساتھ اپنوں اور بیگانوں نے کتنا انصاف کیا؟''مباحثے میں شرکت کے لیے جن دو اہل قلم کا انتخاب کیا گیا ہے،اس کو ہم بجا طور پر''حسن انتخاب''کہیں گے،کیونکہ یہ دونوں حضرات رضویات کے سلسلے میں اچھا مطالعہ رکھتے ہیں اور اپنی اپنی سطح پر دونوں حضرات نے اس موضوع پر کافی کام کیا ہے،ان میں ایک محترم ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی ہیں اور دوسرے محترم ڈاکٹر امجد رضا امجد

ہیں-مصباحی صاحب کی تحریر مختصر ہے مگر خوب ہے، انہوں نے اس سلسلے میں کچھ تجاویز پیش کی ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، محترم امجد رضا صاحب نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے اور تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے، ہماری جماعت کے اوپر شدت پسندی کے الزام کا محترم امجد رضا صاحب نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے، بالخصوص انہوں نے اس اہم نکتے کو اجاگر کیا ہے کہ ''ہماری جماعت کے بعض غیر تربیت یافتہ علما کی شدت مزاجی کے سبب ان خانقاہوں سے ہمارے روابط منقطع ہو گئے یا کمزور پڑ گئے جن سے کبھی اعلیٰ حضرت کا گہرا اور مستحکم رشتہ تھا'' جماعتی اتحاد و اتفاق کو از سر نو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ہمیں اس پہلو پر سنجیدگی سے اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے-ایک جگہ محترم تحریر فرماتے ہیں ''اظہار خیال ضروری سمجھتے ہوئے دو چند جملے حاضر کرتا ہوں'' ہماری ناقص معلومات کی حد تک ''دو چند'' دو گنے کو کہتے ہیں، اگر یہ درست ہے تو پھر یہاں ہم ''دو چند جملے'' کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں-

اظہار خیالات کا کالم بھی دلچسپ ہے، محترم پروفیسر طلحہ رضوی برق صاحب نے محترم شرر مصباحی کی جوابی تحریر کے جواب میں متانت، شائستگی، اور سنجیدگی کے ساتھ اپنا دفاع کیا ہے اور آخر میں یہ بزرگانہ جملہ بھی سپرد قلم فرمایا ہے کہ ''گفتار چاندی ہے تو خامشی سونا'' گویا......ع

بیا کہ من سپر انداختم اگر جنگ است

جواب کا یہ اسلوب محترم برق صاحب کے خانقاہی مقام و مرتبے کے شایان شان ہے-اس مرتبہ مولانا صغیر اختر صاحب نے محترم شرر مصباحی صاحب سے اپنی کسی تشویش کا اظہار کرنے کی بجائے براہ راست جام نور کے قارئین کو اپنی تحریر سے نوازا ہے، جام نور کی بزم میں ان کا خیر مقدم ہے-اُدھر اشرفیہ میں کسی ''دشمن'' نے یہ افواہ پھیلا دی کے جناب شرر مصباحی نے اعلیٰ حضرت کے ایک شعر کی اصلاح کی ہے (ہم یہاں قصداً ''اصلاح پھیری ہے'' سے گریز کر رہے ہیں) اس کے جواب میں محترم شرر صاحب کو وضاحت کرنا پڑی کہ یہ اصلاح نہیں بلکہ تصحیح ہے، اب دیکھنا ہے کہ اس وضاحت کے بعد'' چند ناپختہ ذہن

افراد''مطمئن ہوتے ہیں یا پھر اپنی عاقبت....

بلیک برن انگلینڈ سے کوئی مولانا نظام الدین مصباحی صاحب ''منصب افتاء کے تعلق سے چند گزارشات'' لے کر نمودار ہوئے ہیں۔ موصوف نے ایک عدد ''مفتی بورڈ'' تشکیل دینے کی تجویز رکھی ہے، یہ تجویز واقعی بڑی اہم ہے، اس پر فوراً عمل ہونا چاہیے، مگر سوال یہ ہے کہ اس پر عمل کون کریگا؟؟ گزشتہ دو سال سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ جام نور کا کالم ''اظہار خیالات'' ملت، جماعت، مسلک، نصاب تعلیم اور بورڈوں، مجلسوں، لائبریریوں، وغیرہ کے سلسلے میں مفت مشوروں، تجویزوں اور گزارشوں کے لیے وقف ہو کر رہ گیا ہے، ہماری جماعت میں جس کو بھی ذرا قلم پکڑنا آتا ہے وہ جام نور کے ذریعے کچھ مفت اور مفید مشورے دینا اپنا بنیادی حق اور جماعت کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتا ہے، لیکن جب عملی میدان میں کچھ کر گزرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ہم کسی صلاح الدین ایوبی کی پیدائش یا امام مہدی کے ظہور کی دعاء کر کے یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ محترم مولانا نظام الدین صاحب اپنی تحریر کے اختتام پر لکھتے ہیں کہ ''امید کہ اس تجویز کو سراہا جائے گا'' گویا ان کو بھی یقین ہے کہ ان کی اس تجویز پر عمل ہونا مشکل ہے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ لوگ میری تجویز پر عمل نہ کریں نہ سہی مگر کم از کم اس کو سراہ تو دیں۔ محترم کی تحریر میں کئی جملے زبان وادب کی رو سے محل نظر ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں ''ایمان مخالف شعائر سے دور رہنے کی تعلیم و تلقین بھی دی جاتی ہے''، تعلیم دی جاتی ہے یہ تو ہم بھی جانتے ہیں مگر تلقین کس طرح دی جاتی ہے اس کی وضاحت تو صاحبِ تحریر ہی فرمائیں گے۔ اسی طرح ''منصبِ تدریس کی اہلیت'' کی شرطیں کن کتب فقہ میں درج ہیں ان کی نشاندہی بھی محترم مصباحی صاحب ہی فرما سکتے ہیں۔ بہر حال یہ مولانا موصوف کی جام نور میں پہلی تحریر ہے لہٰذا ہم ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے آئندہ بھی ان کے قلمی تعاون کی امید کرتے ہیں۔

جہان ادب میں محترم ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب کی تحریر طوالت کے باوجود ہم نے توجہ اور دلچسپی سے پڑھی، داغ کی جانشینی کے مسئلے پر محترم سنبھلی صاحب نے جو وضاحت کی ہے اس میں کافی وزن معلوم ہوتا ہے، اب دیکھنا ہے کہ حضرتِ شرر اس سلسلے میں کیا فرماتے

ہیں، ہم خواہ مخواہ اس اکھاڑے میں کود کر اپنی ''عاقبت خراب کرنا'' نہیں چاہتے اس لیے اس تحریر پر مزید کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ حاصل مطالعہ کے کالم میں اس بار بھی منظر الاسلام صاحب جلوہ گر ہیں، رویت ہلال کے سلسلے میں ان کی یہ تحریر ان کی گہری نظر اور وسعت مطالعہ کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ منظر صاحب نے ایک جگہ ''مکتبۂ فکر'' لکھا ہے، یہ کتابت کی غلطی بھی ہوسکتی ہے، تاہم اطلاعاً عرض ہے کہ صحیح لفظ ''مکتب فکر'' ہے۔

پچھلے شمارے میں جہان ادب کے کالم میں ''برق و شرر کی تابشیں'' تھیں تو اس مرتبہ منظومات کے کالم کو ان دونوں حضرات نے اپنی تابشوں سے منور کر دیا ہے۔ محترم طلحہ رضوی برق صاحب کی نعت پاک میں فن، زبان اور عشق تینوں کا ایسا خوبصورت مثلث ہے جس نے ان کے ہر شعر کو ستاروں کی انجمن بنا دیا ہے۔ البتہ اس مصرع پر ہماری نگاہ رک گئی......ع

سمجھنے کو بقا لازم فنا معلوم ہوتا ہے

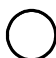
اس مصرع میں یا تو تصوف کے کسی مسئلے کی طرف اشارہ ہے یا پھر اس میں کتابت کی کوئی غلطی ہے، کیونکہ موجودہ صورت میں ہم اس کا معنیٰ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بالخصوص لفظ ''لازم'' ہماری ناقص فہم سے ماورا ہے۔ اگر محترم برق صاحب اس مصرع کی تشریح و تفہیم فرمائیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہماری طرف سے ''جام نور کے انٹرنیشنل قارئین کی کوئی فہرست'' پیش نہیں کی جائیگی۔ مکرمی شرر مصباحی صاحب کا تعارف بہت عمدہ ہے جس طرح نثر کے میدان میں شرر صاحب کا قلم اپنی جولانیت دکھاتا ہے اسی طرح میدان نظم میں بھی وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا، ہر شعر شرر صاحب کی فنی مہارت اور زبان پر قدرت کا شاہکار ہے۔ مولانا قمر احمد اشرفی صاحب کو اب تک ہم جام نور کے مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے جانتے تھے، اس شمارے میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک طرحدار شاعر بھی ہیں، ان کی غزل پسند آئی۔ جناب ارشد رضا کیف الحسن قادری کی نعت پاک بھی مرصع ہے۔ خطوط کے کالم میں اس بار محترم صبیح رحمانی صاحب نے کرم فرمایا ہے، انہوں نے اِس غریب خامہ تلاش کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کو ہم ان کی محبت ہی سمجھتے ہیں ورنہ....ع

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا

قاری محمد اسماعیل صاحب نے علامہ اقبال کے دو شعر نقل کیے ہیں، ایک مصرع میں معمولی سا تصرف ہو گیا ہے، صحیح مصرع یہ ہے ''نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا'' ۔ یہ شمارہ جب آپ کے ہاتھ میں ہو گا تو غالباً ماہ مبارک کا آخری عشرہ ہو گا، لہٰذا ہم اپنے تمام قارئین کو **عید الفطر** کی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی نہایت افسوس کے ساتھ یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ اگلے شمارے میں آنے والی خامہ تلاشی آخری ہو گی اور اس کے بعد یہ کالم بند کر دیا جائے گا۔

❑❑❑

دسمبر ۲۰۰۶ء



ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

جام نور کا تازہ شمارہ زینت نگاہ ہے، دیدہ زیب سرورق جام نور کا لازمہ ہے، اس بار بھی جام نور نے اپنی اس روایت کو برقرار رکھا ہے، میڈیا کے سلسلے میں دانشورانِ ملت کی آرا سرورق کی زینت ہیں، جو نہ صرف یہ کہ سرورق کے حسن میں اضافے کا سبب ہیں بلکہ جام نور کی وقعت اور وقار کو بھی دوبالا کر رہی ہیں- اداریہ کا عنوان ایک مصرعہ ہے......

''اٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی''

یہ اداریہ دراصل گزشتہ ماہ کے اداریے کا تتمہ ہے، خوشتر صاحب نے ہندی اور انگلش کا ایک ایک ہفت روزہ جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، یہ قدم تو بہت پہلے اٹھایا جانا چاہیے تھا بہرحال ''دیر آید درست آید'' ربِّ مقتدر اس اہتمام شوق کی عمر دراز فرمائے اور اس خواب کو جلد از جلد شرمندۂ تعبیر کرے-

پس منظر و پیش منظر کے کالم میں مولانا اسید الحق صاحب کے مضمون ''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ'' کی چوتھی اور آخری قسط شائع کی گئی ہے، مضمون اپنی طوالت کے باوجود نامکمل ہے- مولانا نے پہلی قسط میں وعدہ کیا تھا کہ آخر میں ہم درست اور مقبول سائنسی تفسیر کی چند مثالیں بھی دیں گے مگر مضمون اپنے اختتام کو پہنچا اور ان مثالوں کے دیدار سے ہم اب تک محروم ہیں- جب تک مقبول اور درست سائنسی تفسیر کی چند مثالیں دے کر اس طریقۂ تفسیر کے جواز کو واضح نہ کیا جائے یہ مضمون ادھورا ہی سمجھا جائے گا-

حالات حاضرہ کے کالم میں مولانا ذیشان احمد مصباحی کا فکر انگیز مضمون ''علما، فتویٰ اور میڈیا'' قابل مطالعہ ہے- اگر مضمون کی ذیلی سرخی کا اعتبار کیا جائے تو یہ مولانا کے کسی فاضل دوست سے ہونے والی ایک ٹیلی فونی گفتگو کی تحریری شکل ہے- ''سر دلبراں'' کو ''حدیث دیگراں'' کا پیراہن عطا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے مگر مولانا ذیشان صاحب نے

اس پل صراط کو بڑی خوبی اور سلامتی کے ساتھ عبور کیا ہے-تحریر بڑی فکر انگیز ہے-مولانا کے فاضل دوست اس مسئلے پر بھی گفتگو کرنا چاہتے تھے کہ مسئلہ تکفیر کو کس انداز میں میڈیا کے سامنے پیش کیا جائے؟ مگر چونکہ یہ ایک نازک اور حساس مسئلہ تھا اس لیے اس پر گفتگو کرنے کی بجائے ''اچھا پھر کبھی'' کہہ کر فون کاٹنے میں ہی عافیت سمجھی گئی، ویسے ذیشان صاحب نے یہ اچھا ہی کیا ورنہ اگر موبائل پر اس موضوع پر گفتگو کی جاتی تو ''موبائل ہینگ'' ہونے سے لے کر ''نیٹ ورک فیل'' ہونے تک ہر قسم کی تخریب کا اندیشہ تھا-

شخصیات اسلام کے کالم میں مولانا رفعت رضا نوری صاحب نے ''مجاہد اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی'' سے ملاقات کروائی ہے- رفعت رضا نوری صاحب نے ابن شداد کے مضمون کی تلخیص اور ترجمانی کی ہے- ہم اپنے ناقص مطالعے کی روشنی میں یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے کہ یہ ''ابن شداد'' کون ہیں؟ اور ان کا یہ مضمون نوری صاحب نے کہاں سے اخذ کیا ہے؟ جب بھی اس قسم کے کسی مضمون کا ترجمہ کیا جائے تو اس کے اصل ماخذ کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے تاکہ تحقیق کرنے والے طلبہ اور اسکالرس کو دقت نہ ہو- بہر حال جب ہم نے ابن شداد کو تلاش کرنے کے لیے مصطفیٰ بن عبداللہ القسطنطینی کی کتاب **ھدیة العارفین لاسماء المؤلفین و آثار المصنفین** کی طرف رجوع کیا تو انکشاف ہوا کہ یہ بہاء الدین ابوالمحاسن یوسف بن رافع الموصلی ثم الحلبی ہیں، جو ابن شداد کے نام سے مشہور ہیں- ان کی ولادت ۵۳۹ھ اور وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی- ان کی ایک کتاب کا نام **النوادر السلطانية والمحاسن اليوسفية فی مناقب السلطان صلاح الدین الایوبی** ہے-(ہدیۃ العارفین: ج۶/ص:۵۵۴، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۲ء)،نوری صاحب نے یہ مضمون غالباً اسی کتاب سے اخذ کیا ہوگا-

اظہار خیالات کے کالم میں محترم ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب نے اس بے بضاعت خامہ تلاش پر کرم فرمایا ہے- محترم گوہر صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور ہم ان کے سامنے طفل مکتب- ان کا مضمون پڑھ کر جو کچھ ہماری ناقص فہم میں آیا تھا ہم نے اس کا اظہار کر دیا تھا، اگر ہمارے کسی تبصرے سے محترم گوہر صاحب کی دل آزاری ہوئی ہے تو ہم اپنے الفاظ

واپس لیتے ہیں۔محترم شمیم گوہر صاحب ہماری معذرت قبول فرمائیں لیکن محترم کے عربی مصرعوں میں عربی لغت اور محاورے کی رو سے جو ضعف اور سقم ہے (جس کی طرف ہم گزشتہ کسی شمارے میں اشارہ کر چکے ہیں) وہ خالص عربی زبان کا مسئلہ ہے، فتویٰ نویسی یا ادبی مضامین کے نشیب وفراز سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں، لہٰذا گوہر صاحب کے نزدیک ان لسانی عیوب کی کوئی حیثیت ہو یا نہ ہو بہر حال وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہیں، گوہر صاحب کی ناراضگی یا ہماری معذرت ان کا کفارہ نہیں بن سکتی۔محترم گوہر صاحب قبلہ کا یہ مشورہ کہ ''ابوالفیض معینی ادبی مضامین کے نشیب وفراز سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے'' ہم بسر وچشم قبول کرتے اگر محترم گوہر صاحب ہمیں یہ نیک مشورہ اس وقت دیتے جب ہم نے ان کا دفاع کرتے ہوئے محترم راجا رشید محمود صاحب پر تنقید کی تھی۔مگر اس وقت تو محترم گوہر صاحب نے ''ادبی مضامین کے نشیب وفراز'' پر اظہار خیال کرنے کے صلے میں ہماری پیٹھ تھپتھپائی تھی......ع ''رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند''۔

جہان ادب میں مکرمی شررؔ مصباحی صاحب نے ''تیشۂ فرہاد برسرِ فرہاد'' کے عنوان سے محترم صابر سنبھلی صاحب کی تحریر ''جوابِ آں غزل'' کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔شررؔ صاحب نے اس مضمون میں پورا ایک صفحہ اس غریب خامہ تلاش کی نذر کیا ہے اس نوازش پر ہم سراپا سپاس ہیں......ع...... اک بندۂ عاصی پر اس درجہ عنایات

محترم شررؔ صاحب نے شکریے کے ساتھ یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ ''معینی نے ہمارے جملے کو بہ ادنیٰ تغیر کئی بار ہمارے سلسلۂ ذکر میں تمسخر کے ساتھ ریپیٹ کیا ہے''۔ہم اپنی صفائی میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حاشا وکلا اس سے ہمارا مقصد تمسخر نہیں تھا بلکہ صرف ''تفنّنِ طبع'' کے لیے ایسا کیا گیا تھا لیکن پھر بھی اگر ہمارا یہ انداز ''طبع شررؔ'' پر گراں گزرا ہے تو ہم اس پر معذرت خواہ ہیں۔''تاہنوز'' چونکہ ایک خالص علمی مسئلہ ہے اس لیے تاہنوز تشنہ تحقیق ہے۔

حاصل مطالعہ کے کالم میں مولانا منظر الاسلام ازہری صاحب ''شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی کی علم حدیث میں گل افشانیاں'' لے کر جلوہ افروز ہیں۔مضمون حسب سابق

معلوماتی ہے، جمع بین الصلاتین کے سلسلے میں سنن نسائی کی ایک روایت ہے، جس میں ایک راوی ولید ہیں جو ابن جابر سے روایت کرتے ہیں- میاں نذیر حسین صاحب نے ولید کو ''ولید بن قاسم'' سمجھ کر اس کی تجریح کر دی- اس کا رد کرتے ہوئے منظر صاحب فتاویٰ رضویہ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ''وہ جسے ولید بن قاسم سمجھ کر رد کر رہے ہیں وہ دراصل ولید بن مسلم ہیں''- یہاں فطری طور پر ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ یہ راوی ولید بن مسلم ہے، کیونکہ روایت میں صرف ''ولید'' آیا ہے- اگر میاں صاحب کا اس کو ولید بن قاسم سمجھنا محل نظر ہے تو پھر اس کو ولید بن مسلم سمجھنے کی بھی کوئی ٹھوس بنیاد ہونا چاہیے- ہم منظر صاحب کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے ''وسیع ازہری مطالعہ'' کی روشنی میں تحقیق کریں اور ثابت کریں کہ یہاں ولید سے ولید بن قاسم نہیں ولید بن مسلم مراد ہے- ہم اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے اس لیے گریز کر رہے ہیں کہ کہیں محترم ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب کی طرح منظر صاحب بھی یہ نہ فرمائیں کہ ''ابوالفیض معینی علم رجال حدیث کے نشیب و فراز سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے''- ہاں البتہ ہم اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ منظر صاحب **ابو الفضل عبیداللہ بن عبداللہ الھروی** کی **المعجم فی المشتبہ اسامی المحدثین** اور **شمس الدین محمد القیسی الدمشقی** کی **توضیح المشتبہ فی ضبط اسماء الرواۃ** کا مطالعہ فرمائیں اور اگر اس کے بعد بھی محترم کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو ہمیں ضرور مطلع کریں، ممکن ہے ''محدود ہندستانی مطالعہ'' کی روشنی میں ان کی الجھن کا ازالہ کر دیا جائے-

مکرمی ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب اور جناب منصور فریدی صاحب کی نعتیں اور مولانا ارشد جمال اشرفی صاحب کی غزل منظومات کے کالم کی زینت ہے، محترم صابر صاحب کی دو نعتیں ہیں ایک کی ردیف ''فیض'' ہے اور دوسری کی ''ربط''- دونوں ردیفیں اچھوتی ہیں اور پھر صابر صاحب نے ان ردیفوں کو جس مہارت اور فنکاری سے نبھایا ہے وہ بھی قابل داد ہے- جناب منصور فریدی صاحب کی نعت پاک بھی پسند آئی مگر یہ مصرع ہماری سمجھ میں نہیں آیا......ع

میں ان کے نام مقدس کا نام لیوا ہوں

''نام لیوا'' کا مطلب ہے ''نام لینے والا'' اب مصرع کا مطلب یہ ہوگا کہ ''میں ان کے نام کا نام لیوا ہوں'' - یہ نام کی تکرار ہماری الجھن کا سبب ہے- منصور صاحب کا یہ شعر ہمیں پسند آیا:

ہزاروں بار لٹاتے ہیں جان و دل تجھ پر
پھر ایک سانس ترے عاشقین لیتے ہیں

لفظ ''عاشقین'' منصور صاحب کے قافیے کی مجبوری ہے، اب یہ تو شؔر صاحب یا صابؔر سنبھلی صاحب ہی بتائیں گے کہ زائر کی جمع زائرین اور واعظ کی جمع واعظین کی طرح عاشق کی جمع عاشقین کا اردو میں چلن ہے یا نہیں؟ ایک اور شعر پر نگاہ رک گئی:

جو ان کے عشق میں جل بھن کے دفن ہوتے ہیں
صلہ بھی عشق کا وہ بہترین لیتے ہیں

اس سے قطع نظر کہ شعر میں اجتماع ردیفین کا عیب ہے ''جل بھن کے کباب ہونا'' تو ہم نے سنا ہے مگر ''جل بھن کے دفن ہونا'' پہلی بار دیکھا، جلنے بھننے کا جو مفہوم عام طور پر سمجھا جاتا ہے یہ اس کا موقع نہیں ہے-

مولانا ارشد جمال اشرفی صاحب نے جدید لب و لہجے میں بہت عمدہ غزل کہی ہے، غزل پڑھ کر بے ساختہ ہمارے منھ سے یہ جملہ نکلا کہ ''مولانا ہو کر ایسے عمدہ شعر کہتے ہیں''، غزل کا ایک شعر ہے:

میں تمہیں پھول کے ریزے بھی نہیں دے سکتا
میرے اشکوں ہی سے تم مانگ سجا کر رکھنا

شعر لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے بہت بلند ہے بشرطیکہ ''پھول کے ریزے'' کی ترکیب زبان کی رو سے درست ہو-

ہم نے گزشتہ ماہ عرض کیا تھا کہ اب خامہ تلاشی کا سلسلہ موقوف کیا جا رہا ہے- ہم رخصت ہوتے ہوئے تمام قارئین کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں- قارئین کی جانب

سے جو پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور جو محبتیں ملی ہیں خامہ تلاشی شروع کرتے وقت ہم نے ان کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ خامہ تلاشی کا مقصد کسی کی تنقیص، توہین، تحقیر یا دل آزاری نہیں تھا، ہم نے اس کو خالص تعمیری مقاصد اور مثبت تنقید کے لیے شروع کیا تھا اور اسی لیے حتی الامکان ہم نے اس بات کا خیال رکھا کہ اسلوب تنقید جارحانہ، اہانت آمیز، کڑوا کسیلا اور غیر علمی نہ ہو بلکہ سنجیدہ اور متین لہجے میں تحریر کے حسن و قبح کو اجاگر کر دیا جائے، ہم اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو جام نور کے قارئین ہی کریں گے (جو بقول شترؔ صاحب جاہل چپٹ نہیں ہیں) لیکن اس کے باوجود اگر کسی ''نازک آبگینے'' کو ہمارے کسی جملے یا تبصرے سے ٹھیس پہنچی ہو یا کسی ''ادارے کی کردار کشی'' کا گمان ہوا ہو تو ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ جب بات نازک آبگینے کی آ گئی ہے تو یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ خامہ تلاشی شروع کرنے سے پہلے ہم نے خوشترؔ سے کہا تھا کہ اگر ہم آپ کی کسی تحریر پر کوئی تنقید و تبصرہ کریں گے تو آپ اسے بعینہٖ شائع کریں گے اور اگر آپ نے اپنے اوپر کیے جانے والے کسی تبصرے پر اپنے ادارتی حق کا استعمال کرتے ہوئے کتر بیونت سے کام لیا تو سمجھ لیں کہ وہ آخری خامہ تلاشی ہوگی۔ ہم یہاں خوشترؔ کی کشادہ قلبی اور وسیع النظری کی ستائش کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے اوپر کی جانے والی ہر تنقید کو بعینہٖ شائع کیا بلکہ اس پر کبیدہ خاطر ہونے کی بجائے اسے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول بھی کیا۔ خوشترؔ کا یہ عمل نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ لائق تقلید بھی ہے، بالخصوص ان مدیروں کے لیے جن کے معیار پر ہر وہ تحریر پوری اترتی ہے جس میں ان کے رسالے کی تعریف، ان کے قلم کا قصیدہ اور ان کی صحافتی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہو اور ایسی کوئی بھی تحریر ان کے رسالے میں اذن باریابی سے محروم رہتی ہے جس میں ان کی کسی تحریر یا فکر پر نقد و نظر یا تنقید و اصلاح کا عمل کیا گیا ہو خواہ وہ کتنا ہی مخلصانہ کیوں نہ ہو۔

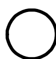
اگر خامہ تلاشی ابوالفیض معینی کی مرہون منت ہے تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ابو الفیض معینی خامہ تلاشی کی دین ہے۔ اگر خامہ تلاشی شروع نہ کی گئی ہوتی تو محترم معینی

صاحب کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا- اب خامہ تلاشی ختم کی جا رہی ہے لہٰذا اصولی طور پر اس کے ساتھ ساتھ جام نور کے صفحات سے ابوالفیض معینی کو بھی رخصت ہو جانا چاہیے تھا، لیکن ابوالفیض معینی ابھی مزید کچھ ماہ آپ کا ہم سفر رہے گا، ہاں ''خامہ تلاش'' آپ سے اجازت چاہتا ہے- اب شاید کبھی آپ کی اس سے ملاقات نہ ہو- آپ یہ سمجھ لیں کہ ایک خانہ بدوش تھا جو کسی نامعلوم مقام سے آپ کی بستی میں وارد ہوا، کچھ دن آپ کے ساتھ گزارے اور جب دل بھر گیا تو اپنا سامان اٹھا کر کسی نامعلوم مقام کی طرف کوچ کر گیا- خانہ بدوش تو خانہ بدوش ہوتا ہے، اس کی شناخت اور معرفت کا کوئی معتبر حوالہ نہیں ہوتا- اب ''خامہ تلاش'' جام نور کے صفحات پر تو موجود نہیں ہوگا مگر قارئین جامِ نور کے دلوں میں، ذہنوں میں، تذکروں میں، تبصروں میں اور ان کے احساسات وخیالات میں ایک طویل عرصے تک اس کی یادیں اس کو زندہ رکھیں گی- جب جام نور آپ کے مطالعے کی میز پر ہوگا تو آپ کو ''خامہ تلاش'' کی یاد آئے گی- جب خوشتر کی تحریر میں کسی جگہ آپ کی نگاہ رک جائے گی تو آپ خامہ تلاش کو یاد کریں گے، جب ذیشان صاحب کے قلم سے تذکیر و تانیث کی کوئی فروگزاشت ہوگی تو آپ کے اندر کا خامہ تلاش فوراً پکار اٹھے گا، جب کوئی ازہری کسی تحریر کا علمی محاسبہ کرے گا یا کوئی بغدادی کسی پر بے جا تنقید کرے گا تو آپ کو خامہ تلاش کی شدت سے یاد آئے گی، جب منظومات کے کالم میں کسی عروضی، فنی یا لسانی عیب پر آپ کی نظر ٹھہر جائے گی تو خامہ تلاش کو آپ اپنے پاس پائیں گے، جب کسی مضمون میں علمی یا تاریخی تسامح پر آپ مطلع ہوں گے تو آپ ضرور خامہ تلاش کی کمی محسوس کریں گے، مختصر یہ کہ:

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مئے کا اور میخانے کا نام

❑❑❑

تعاقب جنوری ۲۰۰۷ء



’’خامہ تلاشی‘‘ بند ہونے کے بعد ’’تعاقب‘‘ کا پہلا نقش حاضر ہے، محترم ابوالفیض معینی صاحب نے اپنی اس پوری تحریر میں ’’تعاقب‘‘ کے پس منظر اور تعاقب نگاری کے اصول پر بحث کی ہے، جس کو پڑھ کر تعاقب کا خاکہ قارئین کے سامنے آجائے گا اور خامہ تلاشی اور تعاقب میں تقابل سے متعلق ان کے تجسس و تشویش میں اضافہ ہو جائے گا، لیکن اگر تعاقب نگار کی اس تمہیدی گفتگو کو پڑھ کر کوئی یہ کہے کہ معینی صاحب کو شاید فرصت نہیں تھی یا انہیں مناسب مواد دستیاب نہیں ہوا یا تعاقب کا خاکہ اب تک خود ان پر واضح نہیں تھا جب ہی انہوں نے بنام تمہید یہ بحث طولانی چھیڑی ہے، تو ہم کسی قیمت پر اس رائے سے اتفاق نہیں کریں گے- بہر کیف! ہم اپنے قارئین کے ساتھ تعاقب کے نقش اول کے بعد نقش ثانی کے منتظر ہیں- (مدیر جام نور)

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

خدا بھلا کرے ہمارے دوست خوشتر نورانی کا، ان کو بھی نئی نئی ترکیبیں سوجھتی ہیں، جس دن سے جام نور کی اشاعت کو چار سال پورے ہوئے ہیں اسی دن سے ان کے سر میں یہ سودا سما گیا ہے کہ اب جام نور میں کچھ جدت کی جائے، اس جدت کے لیے جام نور میں لکھنے والے اور کسی قلم کار پر تو ان کا زور چلا نہیں یہی بے چارہ ابوالفیض معینی قربانی کا بکرا بن گیا اور خامہ تلاشی بند کر دی گئی-

ترے سلیقۂ ترتیبِ نو کا کیا کہنا
ہمیں ملے تجھے دل سے نکالنے کے لیے

اب ان کا کہنا ہے کہ جام نور کے قلم کاروں کی ’’خامہ تلاشی‘‘ کی بجائے مختلف رسائل وجرائد میں لکھنے والوں کا ’’تعاقب‘‘ کروں، گویا اب تک تو غریب ابوالفیض صرف جام نور

کے قلم کاروں سے کھری کھوٹی سنتا تھا اب سارے زمانے کے اہل قلم کا تختۂ مشق بننے کے لیے تیار ہو جائے۔ خدا جانے خوشتر نے ہمیں یہ کس جرم کی سزا دی ہے۔ چلیے خیر ''خیالِ خاطرِ احباب'' کے لیے یہ بھی سہی۔

صالح تنقید کسی بھی معیاری ادب کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کی صحت کے لیے صاف ہوا، چونکہ ہمارے یہاں ابھی تنقیدی شعور اتنا بیدار نہیں ہوا ہے اس لیے عموماً تنقید کو تنقیص کا مترادف سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ تنقید کا حقیقی مقصد ''حسن و قبح کا اظہار'' ہے۔ تنقید نگار بالکل اس مالی کی طرح ہوتا ہے جو گلشن کا جائزہ لیتا ہے اور جہاں بھی خوشنما غنچوں کے جلو میں بدنما جھاڑیاں نظر آتی ہیں ان کو اس مہارت سے صاف کر دیتا ہے کہ غنچہ و گل کی غیرت حسن پر کوئی حرف نہیں آتا، اگر گلشن کو اس عمل سے نہ گزارا جائے تو گل بوٹوں کی دل فریب رنگتیں اور نکہتیں بدنما خود رو پودوں کی زد میں آ کر اہلِ نظر کو دعوت نظارہ نہیں دے پائیں گی۔ جن حلقوں میں نقد و نظر کو مثبت اور تعمیری بنیادوں پر استوار کیا گیا اور علمی و ادبی شہ پاروں کو تنقید کے عمل سے گزارا گیا ان کے یہاں تحریر کا حسن اور نکھرتا گیا اور جن حلقوں میں اس ناگزیر عمل کو ''شجر ممنوعہ'' قرار دے کر تنقید کو تنقیص اور توہین گمان کر لیا گیا وہاں فکری، تحقیقی اور لسانی غلطیوں اور خامیوں کا سلسلہ زلف جاناں کی طرح دراز ہوتا چلا گیا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ''جام نور نے مذہبی صحافت میں جدت پسندی، تنقید و تبصرہ اور نقد و نظر کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا ہے''، اگر یہ کوئی جرم ہے تو ہمیں اس کا ''اقبال'' کرنے میں ذرہ برابر تأمل نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ جام نور نے جمود و تعطل اور تملق و خوش آمد پسندی کی شب تیرہ میں فکر و تحقیق اور نقد و نظر کی جو شمع روشن کی ہے وہ اب مذہبی صحافت کی تاریخ کا ایک زریں باب بن چکی ہے اور یہ تاریخ کسی ریت پر نہیں لکھی گئی جس کو پانی کی کوئی لہر اپنے ساتھ بہا لے جائے۔ یہ حقیقت اپنے تو اپنے غیروں سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ نئی نسلوں میں نقد و نظر کا شعور، فکر و تحقیق کا رجحان اور باصلاحیت اہل قلم میں لکھنے کی نئی امنگ اسی ''جدت پسندی'' کی سوغات ہیں، جن کی رعنائیاں اور جلوہ سامانیاں اب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ''خامہ کس قصد سے اٹھا تھا کہاں جا پہنچا''۔ ہم

عرض کر رہے تھے کہ صالح اور مثبت تنقید کسی بھی ادب کے فروغ، اس کے ارتقا اور اس کے نکھار کے لیے ایک ناگزیر عمل ہے جس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے ،تنقید کی اسی اہمیت اور ہمہ گیر افادیت کے پیش نظر جام نور میں خامہ تلاشی کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا، جس کا مقصد کسی کی ''پگڑی اچھالنا'' نہیں تھا بلکہ اس کو خالص تعمیری اور اصلاحی مقاصد کے تحت شروع کیا گیا تھا ،ہمیں جس تحریر میں جو خوبی نظر آئی ہم نے اس کے اعتراف اور توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، اسی طرح جہاں بھی کسی تاریخی، تحقیقی، یا لسانی تسامح پر نظر رکی تو سنجیدہ لب و لہجے میں قلم کار کو اس کی طرف متوجہ کر دیا، اس سے جہاں جام نور کے کاروانِ نقد ونظر کی تیز گامی میں اضافہ ہوا، وہیں جام نور کے قلم کار بھی محتاط ہوتے چلے گئے ،اور دن بدن جام نور کے علمی اور ادبی معیار میں اضافہ ہوتا گیا۔

اب ہم ''تعاقب'' کے نام سے ایک نئے سلسلے کا آغاز کرنے جا رہے ہیں، خامہ تلاشی کی طرح یہ سلسلہ بھی مثبت اور تعمیری ذہن کے ساتھ شروع کیا جا رہا ہے،تعاقب کا یہ مقصد نہیں ہے کہ خوامخواہ دوسروں پر کیچڑ اچھال کر اپنے ''پندارِ علم کا ڈھنڈورا پیٹا جائے'' بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں بھی عقیدے کا انحراف، اسلامی فکر کی پامالی، مسلکی کج روی یا تاریخی، تحقیقی، لسانی، اور عروضی وفنی تسامح نظر آئے اس کو سنجیدہ اسلوب اور دلائل کی روشنی میں اجاگر کر کے لوگوں کو حقیقت حال سے واقف کرا دیا جائے، ہمہ دانی کا دعویٰ نہ کبھی تھا نہ اب ہے، ہم خود کو ایک ادنیٰ طالب علم سمجھتے ہیں، اسی لیے یہاں ان جملوں کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں جو ہم نے خامہ تلاشی کی ابتدا کے وقت لکھے تھے کہ ''ہماری کوئی تحقیق یا تنقید نقد ونظر سے بالاتر نہیں ہے، ہماری کسی بھی رائے سے اتفاق واختلاف کا ہمارے قارئین کو پورا حق حاصل ہے، کسی بھی معقول گرفت اور سنجیدہ تنقید کو ہم کشادہ قلبی سے قبول کرتے ہوئے غلطی کے اعتراف اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنے کو ہر وقت تیار ہیں''۔ ہندو پاک سے شائع ہونے والے مختلف مسالک اور مکاتب فکر کے ترجمان دو درجن سے زائد رسائل وجرائد ہمارے مطالعے کی میز پر ہیں، جن کا گہرا تنقیدی مطالعہ کر کے ہم ہر ماہ چند رسائل پر تبصرہ کریں گے، یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر کسی رسالے کے ذمہ

داران یہ نہیں چاہتے کہ ان کے رسالے کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو وہ جام نور کے پتے پر خط لکھ کر ہمیں مطلع فرما دیں ہم ان کے رسالے کو ''تعاقب'' کی میز پر نہیں سجائیں گے، کیونکہ ''تنقیدی دہشت گردی'' کے ذریعے قلمی اور صحافتی حلقوں میں ''چودراہٹ'' قائم کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ''تعاقب'' میں ہماری زیادہ توجہ ان رسائل و جرائد پر مرکوز رہے گی جو علم و تحقیق کے نام پر مسلکی غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں، جماعت اہل سنت اور مذہب احناف کی مستدل احادیث و روایات کو اپنی خود ساختہ علتوں اور جرحوں کی بنیاد پر ضعیف اور موضوع قرار دینا، ائمہ مجتہدین اور اہل تصوف کے بارے میں غیر منصفانہ طرز عمل، روشن خیالی کے نام پر اسلام کی بنیادی تعلیمات سے انحراف، جدت پسندی کے پردے میں علما اور مذہبی حلقوں پر رکیک حملے اور ادب کے نام پر بے ادبی اور اباحیت کو فروغ دینا، یہ وہ مرکزی موضوعات ہیں جن کے تناظر میں ہم اہل قلم کا ''تعاقب'' کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ خامہ تلاشی کی طرح قارئین جام نور اس سلسلے کو بھی پسند کریں گے ،ہمیں آپ کی رائے اور مفید مشوروں کا انتظار رہے گا۔

ہم خوشتر صاحب کی طرف سے یہاں یہ وضاحت بھی کر دیں کہ جام نور کو اہل سنت کے دیگر رسائل سے نہ کسی طرح کی معاصرانہ رقابت ہے اور نہ انہیں زیر کرنے کی تمنا، بلکہ بارگاہ رب العزت میں ہم دست بدعا ہیں کہ اہل سنت کا ہر رسالہ مذہبی صحافت کے آفاق کا سفر طے کرے، اس لیے ہم کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے کسی اپنے رسالے کو تعاقب کا نشانہ بنائیں اور نہ ہی ہم یہ پسند کریں گے کہ استعاراتی زبان میں کسی کے وقار کو مجروح کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن ان رسائل کے اندر جو خامیاں خالص علمی نوعیت کی ہوں گی ان پر ''تطفل'' کے لیے یہ غریب تعاقب نگار ضرور اجازت چاہے گا۔ ادارہ جام نور کی طرف سے ہم مدیران رسائل کے حضور یہ التماس بھی کر دیں کہ نقد و نظر کے لیے ہم نے اپنے آپ کو جن اصولوں کا پابند بنایا ہے دیگر رسائل بھی جام نور پر نقد و نظر کرتے ہوئے ان اصولوں کو مد نظر رکھیں، ورنہ ہو سکتا ہے کہ انہیں جواب آں غزل پر ''پیر فلک'' سے ستم کوشی کا شکوہ ہونے لگے کیونکہ......ع

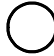
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے

آخر میں چلتے چلتے ہم جام نور کے قلم کاروں کو یہ اطمینان دلا دیں کہ ہم جن رسائل وجرائد کا ''تعاقب'' کریں گے ان میں جام نور شامل نہیں ہے، مگر اس ستم ظریفی کا کیا کیا جائے کہ مولانا منظر الاسلام ازہری کے مضامین جام نور کے علاوہ جن رسائل میں شائع ہوتے ہیں وہ بھی ''تعاقب نگار'' کی میز پر ہیں۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک ست



تعاقب فروری ۲۰۰۷ء



دار المصنفین اعظم گڑھ کا ترجمان ماہنامہ ''معارف'' شمارہ نومبر ۲۰۰۶ء ہمارے مطالعہ کی میز پر ہے، مقالات کے کالم میں ڈاکٹر خواجہ محمد سعید صاحب (شعبۂ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) کا طویل مقالہ بعنوان ''دعا کی اہمیت مذہبی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے'' زینت شمارہ ہے، یہ مقالہ ۲۴ صفحات میں مکمل ہوا ہے، مضمون کئی جہت سے معلوماتی اور انکشافی ہے، مضمون میں کئی ذیلی سرخیاں ہیں مثلاً دعا کی مذہبی اہمیت، دعا کی اہمیت احادیث پاک کی روشنی میں، دعا کی فلسفیانہ اہمیت وغیرہ، دعا کی مذہبی اہمیت بیان کرتے ہوئے مضمون نگار ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''اللہ تعالی کی ننانوے صفات ہیں مگر انسان کو اللہ رب العزت نے سو صفات عطا کیں، یہ سوویں صفت عاجزی وانکساری ہے، اللہ تعالیٰ میں عجز وانکسار نہیں ہوتا، یہ صفت صرف اور صرف انسان کو عطا ہوئی۔'' اس عبارت کا پیرایہ بیان ذرا تشویش ناک ہے، اس کو پڑھ کر قاری کے ذہن پر جو پہلا تأثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ صفات کے معاملہ میں اپنے رب سے بھی آگے بڑھ گیا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور بندے کی صفات میں کوئی تقابل نہیں ہے، اللہ اللہ ہے اور بندہ بندہ، ورنہ اگر اسی طرز پر گفتگو کی جائے تو ایک عجز وانکسار ہی کیا، بندے کے اندر بہت سی ایسی صفات ہوتی ہیں جن کی نسبت بھی اللہ کی طرف کرنا غالباً کفر ہو، اور پھر ہمیں اس جملے پر بھی تأمل ہے کہ اللہ کی صفات صرف ننانوے ہیں، ہمارا یہ تأمل اس وقت اور گہرا ہو جاتا ہے جب چند سطور پہلے مضمون نگار کے اس جملے پر نظر پڑتی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تعداد ۹۹ ہے'' پھر فرماتے ہیں کہ ''ان میں ۹۸ نام جمالی ہیں صرف ایک نام جلالی ہے **المنتقم** (انتقام لینے والا)'' ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ اگر المنتقم جلالی نام ہے تو القہار اور الجبار بھی جلالی کیوں نہیں ہیں؟ اسی صفحہ پر مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ سراپا رحمت ہے'' اس سے غالباً ان کی مراد یہ ہو کہ اللہ بہت رحمت والا ہے مگر اس مفہوم کی تعبیر کے لیے لفظ ''سراپا'' کا استعمال

کہاں تک مناسب ہے یہ تو معارف کے مرتب جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب ہی بتا سکتے ہیں- دعا کے سلسلے میں بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مضمون نگار ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''قرآن پاک میں دعا کی مقبولیت کی دو شرائط بیان ہوئی ہیں نماز اور رزق حلال''- اگر ساتھ ہی قرآن پاک کی ان آیات کی نشاندہی بھی کر دی جاتی جن میں دعا کی مقبولیت کی ان شرائط کا بیان ہوا ہے تو ہم جیسے کم علم ان آیات کو تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جاتے کیونکہ ہزار تلاش کے باوجود ہم قرآن کریم میں وہ آیات تلاش کرنے میں ناکام رہے جن میں دعا کی قبولیت کی مذکورہ شرائط کا بیان ہے-

● ماہنامہ'' اللہ کی پکار'' دہلی کا تازہ شمارہ (جنوری ۲۰۰۷ء) ہمارے پیش نظر ہے، ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' کے مستقل کالم کے تحت جماعت اسلامی ہند کے سابق رکن جناب سالک دھام پوری صاحب کا مضمون ''جماعت اسلامی ہند اقامت دین سے اقامت کمیونزم تک'' کے عنوان سے زینت شمارہ ہے، چونکہ دھام پوری صاحب ''محرم رازِ درونِ میخانہ'' ہیں اس لیے جماعت کے سلسلے میں ان کی فراہم کردہ معلومات زیادہ معتبر کہی جا سکتی ہے، انہوں نے اس مضمون میں اس راز سربستہ سے نقاب اٹھایا ہے کہ ''آج جماعت اسلامی ہند اپنے اصولوں، نظریات، نصب العین اور قرآن و حدیث کے احکامات سے اتنی دور چلی گئی ہے کہ وہ صرف ایک سیکولر اور ملی تنظیم بن کر رہ گئی ہے'' موصوف نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ایک موقع پر سابق امیر جماعت اسلامی ہند نے دہلی ہائی کورٹ میں ایک جھوٹا حلف نامہ داخل کیا تھا، خیر یہ بات ذاتیات سے متعلق ہے جب تک معتبر ذرائع سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے ہمیں اس کی صحت پر اصرار نہیں ہے، اس مضمون میں ایک جملے پر ہماری نظر رک گئی، دھام پوری صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''سید مودودی علیہ الرحمہ کی روح آج بے چین ہوگی کہ ان کی قائم کی ہوئی جماعت اسلامی اقامت دین کی بجائے اقامت کمیونزم کے کام میں پوری تن دہی سے مصروف ہے'' (ص ۸۵) اس جملے پر ہمیں یہ سوال کرنے کا حق دیا جائے کہ جب آپ حضرات کے نزدیک رسول اکرم ﷺ کو اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد اپنی امت کے بارے میں کوئی علم نہیں رہا تو پھر مودودی صاحب

کی روح کو یہ طاقت اور قوت کہاں سے مل گئی کہ وہ اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنی جماعت کے احوال سے باخبر ہے بلکہ بے چین بھی ہو رہی ہے، پتا نہیں رسالے کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر خالد حامدی صاحب کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے؟

● ماہنامہ ''ارمغان ولی اللہ'' پھلت ضلع مظفر نگر (یو. پی) کا شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء زیر مطالعہ ہے، آخری صفحے پر رسالے کے سرپرست مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب نے ''احسان مندی اور احسان شناسی'' کے عنوان سے اپنے شیخ علی میاں ندوی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، علی میاں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ رقم طراز ہیں کہ ''اپنے کسی بزرگ یا بڑوں کا کوئی کتا بھی آ جاتا تو حضرت مولانا فرش راہ بن جاتے'' (ص ۴۰) ہم اس جملے میں لفظ ''کتا'' کا معنیٰ و مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں، اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ان بزرگوں اور بڑوں کا خادم یا نوکر وغیرہ، تو پھر اگر نعت پاک میں شاعر بارگاہ رسالت میں عجز وانکساری کے اظہار کے لیے خود کو سگِ کوچۂ طیبہ نظم کرتا ہے تو اس پر اعتراض کیوں؟

● ماہنامہ ''طلسماتی دنیا'' دیوبند شمارہ دسمبر ۲۰۰۶ء پیش نظر ہے، اس کے مدیر جناب حسن الہاشمی صاحب مستند فاضل دارالعلوم دیوبند ہیں، اس شمارے کے اداریے کا عنوان ہے ''۲۹ کے چاند کا ڈرامہ''، انہوں نے اپنے اس ''طلسماتی اداریے'' میں اپنے درد و کرب کا اظہار ان طلسماتی جملوں میں کیا ہے کہ ''جو دارالعلوم دیوبند برصغیر کے مسلمانوں میں اپنا ایک بھرم رکھتا تھا اور جس کی تصدیق و تردید تمام مسلمانوں کے لیے ایک رہنمائی ہوتی تھی اور اس تصدیق و تردید کے آگے تمام مسلمان اپنا سر تسلیم خم کرتے تھے، آج وہی دارالعلوم ۲۹ کے چاند کی جب تصدیق کرتا ہے، تو ہندستان کے صرف ۲۵ فی صد علاقوں میں عید منائی جاتی ہے اور ۷۵ فی صد علاقوں میں دارالعلوم کی بات کو لوگ ٹھوکر مار دیتے ہیں'' یہ چونکہ دار العلوم اور اس کے ایک مستند فرزند کے درمیان کا معاملہ ہے لہٰذا ہم اس پر بغیر کوئی تبصرہ کیے آگے بڑھتے ہیں، اداریے کا آخری جملہ بھی قابل مطالعہ ہے، لکھتے ہیں کہ ''اس سال بریلوی حضرات نے صحیح موقف اختیار کیا اور انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ چاند کے معاملے میں دیوبندی حضرات زیادہ غیر ذمہ داریوں کا ثبوت دے رہے ہیں''۔ اداریے کی اس

عبارت پر ہماری نظر رک گئی کہ ''آج سے ۱۴سو برس پہلے سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ماہ رمضان ماہ ذوالحجہ کے مہینے ایک سال میں دونوں ۲۹ دن کے اور دونوں ۳۰ دن کے نہیں ہو سکتے، اگر ذی الحجہ کا مہینہ ۲۹ دن کا ہوگا تو رمضان کا مہینہ ۳۰ دن کا ہوگا، اور اگر ذی الحجہ کا مہینہ ۳۰ دن کا ہوگا تو رمضان کا مہینہ ۲۹ دن کا ہوگا'' (ص:٦) جس حدیث سے ہاشمی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے اس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے مگر اسی رسالہ میں صفحہ ۵۷ تا صفحہ ۷۰ پر ہاشمی صاحب کا ایک اور مضمون زینت شمارہ ہے، عنوان ہے ''زورزبردستی کی عید''، اس میں پھر اسی حدیث کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''آپ ایک سو برس کے کیلنڈر اٹھا کر دیکھ لیں، قول رسول کی حقانیت آپ پر منکشف ہو جائے گی، آپ دیکھیں گے کہ اگر کسی سال شوال کا مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے تو ذی الحجہ کا مہینہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے- اور جس سال شوال کا مہینہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے، اس سال ذی الحجہ کا مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے، اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں مہینے ۳۰ دن کے ہوتے ہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دونوں مہینے ۲۹ دن کے ہوں'' (ص:٦٥) ہماری ناقص رائے میں ان دونوں عبارتوں میں دو تضاد ہیں پہلا تو یہ کہ پہلی عبارت میں ذوالحجہ کے ساتھ ماہ رمضان کا ذکر کیا گیا ہے، جب کہ دوسری عبارت میں ذوالحجہ کے ساتھ ماہ شوال کا تذکرہ ہے، دوسرا تضاد یہ کہ پہلی عبارت کے مطابق ایک سال میں ایک ساتھ یہ دونوں مہینے نہ ۲۹ کے ہو سکتے ہیں نہ ۳۰ کے بلکہ ایک ۲۹ کا ہوگا تو دوسرا ۳۰ کا ہوگا، مگر دوسری عبارت کے مطابق کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں مہینے ۳۰ دن کے ہوتے ہیں ہاں دونوں بیک وقت ۲۹ دن کے نہیں ہو سکتے، اب ان میں سے کس کو درست مانا جائے؟ دراصل ہاشمی صاحب نے جس حدیث کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے وہ بخاری و مسلم کی یہ حدیث ہے ''**شهرا عيد لاينقصان رمضان و ذوالحجة**'' (ترجمہ:- عید کے دو مہینے ناقص نہیں ہوتے، ایک رمضان کا دوسرا ذوالحجہ کا- صحیح مسلم: کتاب الصوم: باب بیان معنیٰ قوله ﷺ شهران لا ينقصان- صحیح بخاری: کتاب الصوم: باب شهران لا ينقصان) اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر ارشاد فرماتے ہیں ''**اختلف العلماء في معنىٰ هٰذاالحديث**'' (ترجمہ:- اس حدیث کے معنیٰ میں علما کا اختلاف ہے- فتح الباری

:ج۴،ص:۱۲۵،دارالمعرفۃ بیروت ۱۳۷۹ھ) پھر حافظ نے مختلف علما مثلاً امام بخاری،احمد بن حنبل،طحاوی،بیہقی،اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ کے تقریباً دس بارہ اقوال نقل کیے ہیں،جن میں ایک قول وہ بھی ہے جو ہاشمی صاحب نے پہلی والی عبارت میں تحریر فرمایا ہے ،مگراس میں حافظ نے ''علیٰ طریق الاکثر الاغلب'' کی قید لگادی ہے،یعنی ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا بلکہ کبھی کبھی ایک ساتھ دونوں ۲۹ کے بھی ہوسکتے ہیں،آخر میں حافظ نے ابن المنیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''ان تمام اقوال میں سے کوئی بھی قول اعتراض سے خالی نہیں ہے-(مرجع سابق)شارح بخاری امام قسطلا نی نے بھی ارشاد الساری شرح بخاری میں اس قول کو ''غالباً'' کی قید کے ساتھ ذکر کیا ہے،اوراس قید کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں''اگراس کوعموم پر باقی رکھا جائے تو خلل واقع ہوگا کیونکہ ایک سال میں ان دونوں مہینوں کا ۲۹ کا ہونا پایا جاتا ہے''،امام قسطلانی اپنی بات کو مزید مدلل بنانے کے لیے امام طحاوی کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ ''ہم نے (یعنی طحاوی نے)کئی برس ایک ہی سال میں ان دونوں ماہ کو ۲۹ کا پایا''(ارشادالساری:ج۳،ص:۲۹۰،مطبع الحلبی مصر)جب اس حدیث کے معنیٰ میں اتنے احتمالات ہیں،اور پھر ہاشمی صاحب کا اختیار کردہ احتمال بھی ''اکثر'' کی قید میں بندھا ہوا ہے پھر اتنے وثوق سے یہ کہنا کہ ''حدیث پاک کی رو سے ایک سال میں رمضان اورذوالحجہ بیک وقت ۲۹ کے نہیں ہوسکتے'' کتنا مناسب ہے اس کا فیصلہ ہم قارئین ماہنامہ'' طلسماتی دنیا '' کے انصاف ودیانت کے حوالے کرتے ہیں-

● مولانا وحیدالدین خاں صدر اسلامی مرکز دہلی کی زیر سرپرستی شائع ہونے والے ماہنامہ ''الرسالہ'' کا تازہ شمارہ (جنوری ۲۰۰۷ء) پیش نظر ہے،اس شمارے میں خاں صاحب نے ہندو بیرون ہند کے اہل علم اوردانشوروں سے ہونے والی اپنی مراسلت کو شائع کیا ہے،ان خطوط میں تین خط ہمارے ''دیرینہ کرم فرما'' مولانا منظرالاسلام ازہری کے بھی ہیں،جام نور جولائی ۲۰۰۶ء میں مولانا کا مضمون ''یورپ اور امریکہ کے ممالک دارالدعوہ ہیں'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا،اس پر وحیدالدین خاں صاحب نے ان کو خط لکھا اور پوچھا کہ ''مطلع فرمائیں کہ آپ نے دارالدعوۃ کی اصطلاح کہاں سے اخذ کی''

(ص:۳۳) جواب میں مولانا ازہری نے دوٹوک جواب دیا کہ ''بشمول مذاہب اربعہ کے کسی قدیم فقہی کتاب میں میری نگاہ سے یہ اصطلاح نہیں گزری'' (ص:۳۳) اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ منظر صاحب کی اپنی ایجاد ہے، مگر خاں صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، کیونکہ وہ ''اس کو اجتہاد مطلق کی نوعیت کا ایک واقعہ سمجھتے ہیں'' اور ان کے خیال میں ''دارالدعوۃ جیسا مجتہدانہ قول اتفاقاً کسی کی زبان پر جاری نہیں ہوسکتا''، اس کے جواب میں ازہری صاحب نے ایک طویل خط تحریر فرمایا جس میں اگرچہ اصل مسئلہ پر کم اور ''تحدیث نعمت'' پر زیادہ زور دیا گیا ہے، مگر خط کا یہ جملہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ''آپ کی رائے میں اگر اس طرح کے واقعات کا تعلق اجتہاد مطلق سے ہے تو الحمدللہ! راقم مجتہد مطلق ہے''۔اس پر بھی خاں صاحب کو اطمنان نہیں ہوا، اور انہوں نے پھر لکھا کہ ''آپ کا خط میرے سوال کی نسبت بالکل غیر متعلق ہے، میرا سوال صرف یہ ہے کہ دارالدعوۃ کی اصطلاح آپ کی خود ذاتی دریافت ہے یا آپ نے اس کو کسی کتاب میں پڑھا ہے؟'' (ص:۳۷) اس کے جواب میں پھر منظر صاحب نے اپنے ''ازہری لب ولہجے'' میں فرمایا کہ ''اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے کسی کتاب یا کسی عالم کی زبان سے سن کر اسے نہیں لکھا ہے، بلکہ یہ میری اپنی ایجاد ہے'' (ص:۳۸) اس غیر مبہم اور واضح جملے پر بھی خاں صاحب فرماتے ہیں کہ ''میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ دارالدعوۃ کی اصطلاح آپ نے خود وضع کی ہے، یا اس کو آپ نے کہیں اور سے اخذ کیا ہے، مگر آپ کا مذکورہ مبہم جملہ میرے متعین سوال کا واضح جواب نہیں'' (ص:۳۸) پھر منظر صاحب نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

چونکہ خاں صاحب کے نزدیک یہ معاملہ اجتہاد مطلق سے متعلق ہے اور عصر حاضر میں وہ اپنے علاوہ کسی اور کو ''مرتبۂ اجتہاد مطلق'' کے لائق نہیں سمجھتے، لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ منظر صاحب یہ اعتراف کریں کہ دارالدعوۃ کی اصطلاح میں نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی فلاں کتاب سے اخذ کی ہے، خاں صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ علم وفن اور فکر ودانش پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ چلتے چلتے ہم یہ عرض کردیں کہ سہ ماہی امجدیہ

گھوسی (جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء) میں مولانا منظر الاسلام ازہری صاحب کا مضمون ''اسلامی معاشرہ میں غیر مسلمین سے رواداری'' ہمارے پیش نظر ہے، مگر جگہ کی قلت کے باعث ہم اس سے صرف نظر کر رہے ہیں......ع

جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

❏❏❏

اربابِ علم کے تاثرات

علامہ محمد احمد مصباحی (پرنسپل الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور)

مولیٰ تعالیٰ ان (ابوالفیض معینی) کے درجات بلند فرمائے اور ہم میں ان کے امثال زیادہ فرمائے............میں معینی صاحب کی علمی وسعت نظر اور گوناگوں صلاحیتوں کا عام قارئین سے کچھ زیادہ ہی معترف ہوں، اوران کی اس خوبی کو بھی بنظر استحسان دیکھتا ہوں کہ نوجوان اہل قلم کی ہمت افزائی اور رہنمائی کے لیے ان کی تحریروں کو خاص توجہ دے کر اپنی مدح وتنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ تنقید کم تعریف، اصلاح اور حوصلہ افزائی زیادہ ہوتی ہے ،تاکہ اس زمانۂ قحط الرجال میں جو چند افراد قرطاس وقلم سے وابستہ ہوئے ہیں آئندہ بھی وابستہ رہیں، ساتھ ہی ان کی تحریروں میں پختگی اور جلا بھی پیدا ہو۔

(مکتوب بنام خوشتر نورانی: مؤرخہ ۲۵ رشعبان ۱۴۲۷ھ، ۱۹ راگست ۲۰۰۶)

❑❑❑

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی (ریڈر، طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی)

خامہ تلاشی کے کالم میں محترم معینی صاحب نے اپنے الطاف کریمانہ سے احقر کو بھی محروم نہیں رکھا، البتہ اگر مضمون کی قسطیں پوری ہونے کے بعد اظہار خیال فرماتے تو شاید کچھ اور مسالہ ہاتھ آجاتا۔ محترم نظمی صاحب سے فی الواقع میں واقف نہیں تھا، کبھی کبھار نام سن لیا یا ایک بار اسٹیج پر پڑھتے ہوئے دیکھ لیا، یہ واقفیت نہیں ہے، اس لیے اگر'' وسیع الاطلاع'' کو تقطیع میں محسوب نہ کیا جائے اور گوشہ نشینی وگمنام پر تحقیق کا عمل برقرار رہے تو میرے خیال میں باقی کلام کو'' بحر غنیمت'' میں موزوں قرار دیا جاسکتا ہے۔

محترم مدنی میاں صاحب کے نعتیہ کلام کی تعریف وتوصیف کے بعد توالی اضافت کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے، یہ طرز تحریر ایک پختہ ذہن اور بالغ نظر نقاد کا ہی ہوسکتا ہے، اگر چہ شعر کی تعریف کو مقدم اور توالی اضافت کے تعلق سے استفسار کو مؤخر کیا گیا ہے، لیکن سخن گسترانہ بات اسی جز مؤخر میں ہے، یہاں شرر مصباحی سے اصلاً استفسار مقصود نہیں ہے بلکہ استفسار کے پردے میں ایک شعری عیب کو طشت از بام کرنا ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے اساتذۂ فن کے یہاں تین سے زائد اضافتیں خلاف فصاحت ہیں، گو غالب بھی اس سے

محفوظ نہیں ہے۔

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگ خار میرے آئینہ سے جوہر کھینچ

(شمارہ جون ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

خامہ تلاشی میں راجا رشید محمود کی اچھی خبر لی گئی ہے۔ایک ہندوستانی شاعر نے ''اپکار'' کا استعمال کیا کیا راجا صاحب کے سر سے گویا قیامت گزر گئی ہے،اب دیکھنا ہے راجا صاحب کے ہاتھوں اس بدنصیب پاکستانی شاعر کا کیا حشر ہوتا ہے، جو اپنے مندرجہ ذیل شعر میں ''سنسار'' استعمال کر کے جامِ نور کی بزمِ منظومات میں شریک ہوا ہے:

حاضر و ناضر (ناظر) ہوئے نظر و تصرف سے حضور
ہاتھ میں ہر شئی ہے آنکھوں میں ہے کل سنسار بھی

نظر و تصرف میں لفظ ''نظر'' کے استعمال کے تعلق سے جملہ حقوقِ انتقاد بحق ابوالفیض معینی محفوظ۔ (شمارہ ستمبر ۲۰۰٦ء)

❑❑❑

جامِ نور شمارہ اکتوبر میں مولانا ابوالفیض معینی کی خامہ تلاشی میں ہمیں دو باتیں صاف نظر آئیں جو ان کی روایتی تحریر سے میل نہیں کھاتیں، (۱) محترم طلحہ صاحب کے ''محذوذ'' سے ان کا صرف نظر کرنا (۲) عالم تصورات میں مولانا صغیر مصباحی کے استفسار دربارۂ'' تاہنوز'' کا جواب دینا، ،پہلی بات تو یوں کہ محذوذ'' ناک کی سیدھ میں تھا جس سے نظر چرائی نہیں جاسکتی تھی اور دوسری بات یوں کہ تاہنوز ان کی نظر میں قابل گرفت تھا اسی مرکز تصور نے عالم تصورات کا سارا ڈراما رچنے پر انہیں مجبور کیا حالانکہ یہ ایک خالص علمی مسئلہ تھا اسے عالمانہ انداز میں بیان کرنے پر وہ پوری طرح قادر تھے پھر یہ کہ اگر مولانا صغیر اختر مصباحی، معینی صاحب سے استفسار کرتے اور جواب نفی میں پاتے تو پھر ان سے ''تاہنوز'' کا استعمال کیوں کر متوقع تھا۔ (شمارہ اکتوبر ۲۰۰٦ء)

معینی صاحب نے ''برق وشرر'' کی ترتیب کے لحاظ سے امریکہ اور روس استعمال کیا ہے چونکہ وہ بلا کے ذہین ہیں اور وہ ایک ایک لفظ ناپ تول کر بولتے ہیں اس لیے امریکہ جیسے سپر پاور اور سقوط روس کے بعد روس کی موجودہ پوزیشن سے وہ جو معنویت پیدا کر رہے ہیں اس کا ہمیں اعتراف ہے لیکن از راہ انکسار جو خود بدولت نیپال بن رہے ہیں، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے بلکہ یہاں سراسر برطانیہ کے رول میں نظر آ رہے ہیں- معینی صاحب کا یہ جملہ بھی از راہ انکسار ہے کہ وہ محاکمہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، بیشک وہ محاکمہ کرنے کی پوزیشن میں ہیں بلکہ ان کا یہ حق کوئی سلب نہیں کر سکتا البتہ وہ حکم نہیں بن سکتے، محاکمہ اور حکم کے فرق کو معینی صاحب ضرور جانتے ہوں گے- امریکہ اور روس کے درمیان نیپال کیا حکم بنے گا، نیپال اور بھوٹان کے درمیان امریکہ بھی حکم نہیں بن سکتا جب تک طرفین کی اجازت یا رضا اسے حاصل نہ ہو-

معینی صاحب نے ہمارے جملے ''یہ از قسم استفسار تھا جس پر میں نے غور کیا اور اب تک غور کر رہا ہوں'' کو بہ ادنی تغیر کئی بار ہمارے سلسلہ ذکر میں تمسخر کے ساتھ ریپیٹ کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں- محترم طلحہ صاحب کے اوریجنل خط کی فوٹو کاپی موصول ہونے کے بعد جب ہماری نظر ''محذوف'' پر پڑی تو ہمیں لکھنا پڑا کہ ''اگر آپ نے (مدیر جام نور نے) مجھے موصوف کے خط کی شائع شدہ کاپی بھیجی ہوتی تو میں باور کر لیتا کہ کاتب دیوبندی رہا ہوگا، معینی صاحب نے اس جملے کو یوں ریپیٹ کیا ہے ''چونکہ ہمارے سامنے شرر صاحب کی مطبوعہ کاپی ہے، لہٰذا ہم باور کر لیتے ہیں کہ کاتب دیوبندی رہا ہوگا'' یہاں ہم معینی صاحب سے کہنا چاہیں گے، من چہ سرائم وطنبورۂ من چہ سراید ہمیں طلحہ صاحب کی اصل تحریر کی فوٹو کاپی ملی تھی اگر ان کا یہ خط کہیں پٹنہ وغیرہ کے کسی جریدے میں شائع ہوا ہوتا اور اس کی کاپی موصول ہوئی ہوتی تو یہ باور کرنے لینے میں کیا مضائقہ تھا کہ کاتب دیوبندی رہا ہوگا لیکن یہاں شرر مصباحی کی جو مطبوعہ تحریر جناب کے سامنے ہے یہ تحریر تو جام نور میں شائع ہوئی ہے اور جناب کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ جام نور کے کارپردازوں میں کوئی دیوبندی نہیں ہے، اس لیے متذکرہ جملے کو تمسخر کے علاوہ اور کس پر محمول کیا جائے؟

غلطی کی نشاندی کرنا غلط نہیں ہے لیکن صحیح لفظ پر غلط ہونے کا تاثر دینا (واڑ گوں- وازوں وغیرہ) یا کسی پر اپنی مرضی تھوپنا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے، مولانا سید رکن الدین اصدق مصباحی صاحب کے ایک مضمون کا عنوان ہے ''علامہ فضل حق خیرآبادی و فتویٰ جہاد'' اس عنوان کے تعلق سے معینی صاحب یوں اظہار خیال فرماتے ہیں ''مضمون کے عنوان میں اگر ''و'' کی جگہ ''اور'' ہوتا تو غالباً زیادہ بہتر ہوتا''- یہاں ''غالباً زیادہ بہتر ہوتا'' کا مفہوم ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ معینی صاحب کی نظر میں ''و'' بھی غلط نہیں ہے اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو اب ہر کوئی معینی صاحب جیسا استاذ کل تو ہے نہیں اس لیے بہتر کو اور زیادہ بہتر لفظ سے بدلنے کی توقع ہر کسی سے کیونکر کی جاسکتی ہے؟ معینی صاحب کو شکایت ہے کہ ''شررصاحب کے ذریعہ پیش کردہ ہندوپاک کے اہل نظر کی فہرست میں بے چارے ابوالفیض معینی کا نام نہ آسکا تو اس پر ہمیں کوئی شکوہ نہیں البتہ ان خوش نصیبوں میں ہندوستان سے محترم اشرف صاحب مارہروی اور پاکستان سے جناب کوکب نورانی کا نام تو آسکتا تھا'' یہاں ہم معینی صاحب کی سیاسی بصیرت اور وقت شناسی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے، تاہم عرض ہے کہ جن اہل نظر کی فہرست پیش کی گئی ہے اگر ان میں کیڑے نکال سکتے ہوں تو بے شک ہم فہرست پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہیں، یوں تو سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوسکتا ہے-

ہم معینی صاحب سے گزارش کرتے ہیں کہ ماشاءاللہ آپ ہرفن مولا ہیں علوم وفنون پر ملکہ راسخ رکھتے ہیں براہ کرم ان اشکالات کا حل پیش فرما کر احسان فرمایئے جن کا ذکر محترم طلحہ صاحب کے سلسلہ بیان میں ہوا یہ نیک کام آپ ضرور کرسکتے ہیں ہاں! اگر کوئی مصلحت دامن گیر ہو یا یہ نزاعی بحث جسے اب تک آپ ایک تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ فرماتے رہے ہیں اسی میں آپ کے سکون کا سامان ہو تو ہمیں اصرار بھی نہیں ہے- ''تاہنوز'' ایک خالص علمی مسئلہ ہے اس پر آئندہ کبھی اظہار خیال کیا جائے گا- (شمارہ نومبر ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

خامہ تلاشی کا سلسلہ موقوف کر کے آپ نے ایک طوفان کی آمد روک دی ہے، کیونکہ

اب خامہ تلاش کا انتقادی قلم علم سے زیادہ پندار علم کا ڈھنڈورچی ہو گیا تھا، جاتے جاتے مولانا معینی نے ازہری اور بغدادی کے ساتھ ساتھ جام نور ٹیم کے مولانا مصباحی کی (مستقبل میں) متوقع تذکیر و تانیث کی غلطیوں کو اساس بنا کر جو پگڑی اچھالی ہے اسے آپ نے ضرور نوٹ کیا ہوگا، اسی طرح رخصت ہونے کی منظر کشی پر بھی یقیناً آپ کی نظر ٹھہر گئی ہوگی، جیسے کوئی قطب وقت دنیا سے اٹھ رہا ہے اور سارا عالم اسلام سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

گماں مبر کہ چو تو بگزری جہاں بگزشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

(شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء)

❑❑❑

مولانا پیرزادہ اقبال احمد فاروقی (مدیر اعلیٰ ''جہان رضا'' مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور، پاکستان)

''خامہ تلاشی'' کے عنوان سے جو ''گل پاشی'' کی گئی ہے اس سے دل و جان وجد کناں ہوئے۔ (شمارہ جولائی ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

پاکستان میں ابوالفیض معینی صاحب کی ''خامہ تلاشی'' کو دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، ان کی گرفت پر بعض اوقات ''قربانت شوم'' کہنا پڑتا ہے مگر بعض مقامات پر وہ ''قلم قتلے'' بن کر سامنے آتے ہیں، اس بار ان کی خامہ تلاشی ماہ کی بجائے برسوں پر محیط ہو کر سامنے آئی ہے، پڑھ کر لطف آیا: قرباں بہ لب یار گہے غنچہ گہے گل

اللہ ان کے قلم کی ناز خرامی کو زندہ و تابندہ رکھے۔ (آمین) (شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

میں آپ کے ''اظہار خیالات'' کے کالم میں اظہار خیال کرنا چاہتا تھا، مگر مجھے ابوالفیض معینی صاحب کی ''خامہ تلاشی'' نے دعوتِ تحریر دے کر ''خامہ فرسائی'' پر آمادہ کر دیا۔ میں آپ کے دوسرے قارئین کی طرح ''خامہ تلاشی'' کے کالم کو دلچسپی سے پڑھتا ہوں، معینی صاحب بڑے لطیف انداز میں ''جام نور'' کے صفحات کی ''خامہ تلاشی'' کرتے

ہیں، بعض اوقات ان تحریروں کے دامن کی ’’رفو گری‘‘ بھی کرتے جاتے ہیں، تحریری لغزشوں سے آگاہ کرتے ہیں اور ہمیں احتیاط سے ’’قلم رانی‘‘ پر آمادہ کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں میں نے ’’خامہ تلاشی‘‘ پر ہدیہ تحسین پیش کرتے ہوئے نیٹ ورک کی برق رفتاری سے فائدہ اٹھا کر آپ کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا تھا، مگر وہ غالباً ’’جام نور‘‘ کے نورانی دروازہ پر دستک نہ دے سکا، مجھے معینی صاحب کی ’’خامہ تلاشی‘‘ نے کئی اہل قلم کی یادوں کی خوشبو سے خوش کام کیا ہے، کراچی کے مشفق خواجہ ’’خامہ بگوش‘‘ لکھا کرتے تھے ،کسی زمانہ میں آغا شورش کاشمیری چٹان کے ’’قلم قتلے‘‘ میں نوکیلے جملے لکھا کرتے تھے، مجھے عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر کے کالم یاد آتے ہیں تو ’’خامہ تلاشی‘‘ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔مولانا ظفر علی خان کے ’’زمیندار‘‘ میں لکھے ہوئے ’’مطائبات‘‘ یاد آتے ہیں، مولانا ابوالکلام کی ’’غبارِ خاطر‘‘ کی رعنائیاں ابھی تک یاد ہیں، میں اکبری دربار کے فیضی کی ’’بانگ قلمم دریں شب تار‘‘ ’’بس معنی خفتہ کرد بیدار‘‘ یاد آتی ہے تو ’’خامہ تلاشی‘‘ پر داد دیتا ہوں ۔جب میں فاضل بریلوی کے ’’کلک رضا ہے خنجر خونخوار و برق بار‘‘ کی کاٹ یاد کرتا ہوں تو اعداء کو کہتا ہوں ’’خیر منائیں نہ شر کریں‘‘ میرے دوست مولانا کوکب نورانی جب ’’نعت رنگ کراچی‘‘ کے صفحات پر قلم رانی کرتے ہیں تو علمی بخیہ گری کا قائل ہو جاتا ہوں۔کسی صاحب قلم نے جب ’’دیوبند کی جامہ تلاشی‘‘ لکھی تھی تو کڑوے بادام بن کر آئی ،مگر جو لطافت ونفاست معینی صاحب کی ’’خامہ تلاشی‘‘ میں ہے اس کا جواب نہیں، بعض دفعہ ان کی تحریروں پر گماں ہوتا ہے کہ وہ بر رخسارۂ حور، با روشنائی نور، بقلم سرور لکھی جارہی ہیں۔

(شمارہ جون ۲۰۰۶ء)



دسمبر کا شمارہ پچاسواں جام نور سرور لے کر آیا، مگر آپ کے شذرہ نے ایسی خبر دی جس سے سارا خمار ٹوٹ گیا۔ میں ’’خامہ تلاشی‘‘ کا کالم بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔مگر آپ نے خامہ تلاش (محترم معینی) صاحب کو بایں الفاظ رخصت کر دیا کہ ’’ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں‘‘ پھر خود ’’حضرت خامہ تلاش‘‘ جاتے جاتے خانہ بدوشوں کی طرح کہہ گئے کہ ’’

لو جی ہم جا رہے ہیں''۔

یہ خبر میرے لیے خوش کن نہیں، ابوالفیض معینی صاحب جام نور کی محفل میں پیر مغاں نہیں تھے تو بغچہ ضرور تھے، وہ جام نور کے صفحات کی ۲۱ خامہ تلاشیاں لے چکے تھے۔ بڑے لطیف انداز میں بات کرتے، بات سے بات نکالتے جاتے'' دامن کو ٹک ہلا کہ بجھی ہے دلوں کی آگ'' قارئین جام نور کے دلوں کی آتش شوق کو سلگاتے تھے، اگرچہ ہمارے یہاں نقد و نظر کا رواج روایت بنتا جا رہا ہے۔ علامہ کوکب نورانی نے نعت رنگ میں لکھنے والوں کا تعاقب کیا، وہ اپنے خطوط میں ان دانشوران نعت کو بڑے لطیف انداز میں گرفت کرتے رہے، حتیٰ کہ ان قلمکاروں نے تلخ نگاہی کے باوجود محتاط رویہ اختیار کر لیا۔ ممبئی سے ''افکار رضا'' نے بھی اپنوں کو ہی تعاقبات کا نشانہ بنایا۔ پھر اس انداز نقد و نظر کو ''معارف رضا'' کراچی نے بھی اپنایا۔ مگر جام نور میں ''خامہ تلاشی'' کا جو انداز تھا، وہ منفرد بھی تھا اور اس میں ''شیریں دہن شوند ہمہ طوطیان ہند'' کا رنگ بھی تھا۔ (شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء)



مولانا سید رکن الدین اصدق (مدیر اعلیٰ: سہ ماہی ''جام شہود'' پکی تالاب، بہار شریف)

خامہ تلاشی میں یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ یہ سلسلہ آئندہ شمارہ سے بند ہونے جا رہا ہے۔ بحث و مباحثہ کی تحریریں جب طول پکڑ جائیں تو بند کر دینا اور بات ہے۔ مگر یہ سلسلہ قائم رہنا چاہیے۔ (شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء)



مولانا بہاء المصطفیٰ قادری (استاذ، جامعہ منظر اسلام، سوداگران، بریلی، یوپی)

خامہ تلاشی کے مبصر مولانا ابوالفیض معینی صاحب ہمہ جہت اور گوناگوں خوبیوں کی حامل شخصیت ہیں، ان کا رواں دواں قلم ہر وادی پُر خوار سے سبک روی کے ساتھ گزر جاتا ہے، مگر ان کے تعلق سے قارئین جام نور گومگوں کی کیفیت سے دوچار ہیں، بعض لوگوں کو ان سے یہ شکایت ہے کہ......ع...... خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

مگر میرے خیال میں......ع...... منہ دیکھ کے کیا ہوگا پردے میں بھلائی ہے

ان کا پردے ہی میں رہنا قاری اور مبصر کے حق میں بہتر ہے، ان کے حکم پر مضمون حاضر خدمت ہے اگر لائق اشاعت ہو تو قریبی شمارے میں شائع کر دیں۔

تصویر دیکھنے کی حلّت وحرمت کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ اب مزید اس پر کچھ لکھنا عبث تھا، مگر بھلا ہو محترم مولانا ابوالفیض معینی صاحب کا جن کی ایما پر چند سطور قلم بند کرنی پڑی۔ (شمارہ ستمبر ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

حضرت مولانا ابوالفیض معینی صاحب سے گزارش ہے کہ میرے تمام مضامین اور اس پر مولانا اعجاز نوری صاحب کے ایرادات آپ کے پیش نظر ہیں کیا ان کے ایرادات درست ہیں یا خواہ مخواہ والی بات ہے؟ (شمارہ نومبر ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر (خانقاہ حلیمیہ، محلّہ چک، الہ آباد، یوپی)

آپ بخوبی واقف ہیں کہ پاکستان کے مشہور نعت گو جناب راجہ رشید محمود صاحب کے مجموعۂ نعت ''دیارِ نعت'' پر میرے ایک تبصرہ کے رد میں راجہ صاحب بہت ساری لغو باتیں کہہ گئے تھے، جس کے نتیجہ میں ان کے دوسرے مجموعۂ نعت ''احرامِ نعت'' پر دوران تبصرہ جوش کا غلبہ کچھ زیادہ رہا جس کی زد میں ''عوالم، حجیت، اوراسرا'' کی صحت بھی آگئی مجھے اس کا اعتراف ہے، نادم بھی ہوں۔ مولانا ابوالفیض صاحب معینی کا ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف اس طرف توجہ مبذول کرائی بلکہ راجہ صاحب کے تمام ناجائز حملوں کا شاندار دفاع بھی فرمایا۔ (شمارہ ستمبر ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

مثبت تنقیدی ذمے داری نبھانے کا سب کو حق حاصل ہے مگر تنقیدی کارکردگی کا انفرادی معیار متعین کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ تنقید نگاری کو فتویٰ نویسی کے آئینہ میں دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مولانا ابوالفیض معینی ادبی مضامین کے نشیب و فراز سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔ نعت بیزاری اور ادبی طرفداری کی فوقیت میں کس کس طور پر حملہ کیا جاتا ہے ضروری

نہیں کہ مولانا ابوالفیض معینی تمام باریکیوں کے حالات سے واقف ہی ہوں- ایسی صورت میں اس نوعیت کے کسی بھی ادبی وتنقیدی مضمون سے موصوف متاثر نہیں ہو سکتے-

(شمارہ نومبر ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

سید صبیح رحمانی (مدیر: ''نعت رنگ'' وڈائریکٹر ریسرچ:Qtv، کراچی، پاکستان)

خامہ تلاشی جام نور کا دلچسپ سلسلہ ہے، جس طرح نعت رنگ کو مولانا کوکب نورانی مل گئے جو اس کے مشمولات کا تنقیدی جائزہ شریعت کی روشنی میں لیتے ہیں اسی طرح آپ کو ابوالفیض معینی صاحب مل گئے ہیں جو گزشتہ شمارے کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں- یہ کام بہت دشوار ہے لیکن انہوں نے اپنی تحریر کو متوازن رکھ کر اپنی علمی قابلیت اور اعتدال پسندی کو منوالیا ہے-
(شمارہ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

پروفیسر فاروق احمد صدیقی (صدر شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار)

یہ جناب ابوالفیض معینی صاحب کون ہیں؟ اور کیا ہیں؟ ذرا ان کا مختصر تعارف کرادیں، ہر شخص اپنی محبوب شخصیت سے ملنا اور ہم کلام ہونا چاہتا ہے، میں ان کی تحریریں اسی ذوق وشوق سے پڑھتا ہوں جس طرح مرحوم مشفق خواجہ کے ادبی کالم ''خامہ بگوش'' کو پڑھا کرتا تھا، میں معینی صاحب کی وسعت معلومات، ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کا دل سے قائل اور معترف ہوں، ان کو میرا اسلام پہنچا دیجیے اور ان سے رابطہ کا نمبر بھی بتلا دیجیے کہ بقول جامی ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(شمارہ نومبر ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

''جام نور'' شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء پیش نظر ہے، حسب توقع بوقلموں مضامین و مشتملات

سے مزین۔ ''خامہ تلاشی'' کے تحت محترم ابوالفیض معینی صاحب نے شمارہ دسمبر ۲۰۰۵ء میں شائع شدہ میرے سوانحی مضمون ''حضرت مولانا عبدالرحمٰن محبی ایک کثیرالجہات شخصیت'' کو پسند فرمایا،اس کے لیےان کا دلی شکریہ،انہوں نے اس میں جن کمیوں اور کوتاہیوں کی طرف اشارے کیے ہیں،ان سے مجھے کامل اتفاق ہے۔ یہ مضمون دراصل نبیرۂ محبی عزیزی ریحان انجم نے عرس محبی کے موقع پر شائع ہونے والے ایک خصوصی نمبر کے لیے لکھوایا تھا،اس لیے میں نے اس میں حضرت محبی کی سال ولادت اور آخری آرام گاہ کا تذکرہ نہیں کیا تھا،لیکن افسوس وہ نمبر نہیں نکل سکا اور عزیزی انجم نے چپکے سے یہ مضمون اشاعت کے لیے جناب خوشتر نورانی کے حوالے کر دیا۔ آپ نورانی صاحب سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں ،بہرحال آپ نے صمیم گرفت فرمائی ہے،اس کے لیے بھی شکریہ۔ (شمارہ فروری ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

ظہیر غازی پوری (ہاشمیہ کالونی،پگمل ،ہزاری باغ،جھارکھنڈ)

''خامہ تلاشی'' جناب ابوالفیض معینی کا بصیرت افروز حقیقت پسندانہ جائزہ ہے، انہوں نے دوعدد فارسی کے اشعار کی توضیح وتشریح کی گزارش کی ہے،اشعار واقعی قابل غور و خوض ہیں،ایک شعر علامہ جامی کا ہے اور دوسرا کسی بزرگ شاعر کا مگر نام کیوں مخفی رکھا گیا، بات سمجھ میں نہیں آئی، میں معینی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میری حمدیہ رباعیات پر پسندیدگی کا اظہار کیا،انہوں نے میرے مراسلے کے ایک چبھتے ہوئے جملے پر ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا ہے،حقیقتاً وہ جملہ فاضل مضمون نگار کے معاندانہ رویہ اور غیر ادبی طریقۂ کار کے باعث ازخود صفحۂ قرطاس کی زینت بن گیا تھا۔ (شمارہ نومبر ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

مولانا سید آل رسول حبیبی (سجادہ نشین خانقاہ حبیبیہ قدوسیہ،مرزاپور بھدرک،اڑیسہ)

''خامہ تلاشی'' کا کالم نئی اور اچھی پیش کش ہے،اس نے جام نور کو مزید دلچسپ اور پر کیف بنا دیا ہے،خامہ تلاش ابوالفیض معینی کا قلم پختہ اور شستہ ہے،مختلف علوم وفنون پر مشتمل مضامین پر تنقید وتبصرے ان کی وسعت علم کو ظاہر کرتے ہیں ،ویسے خامہ تلاش کی بھی

زبردست تلاشی ہورہی ہے، آخر کب تک وہ چلمن سے لگے بیٹھے رہیں گے؟ باضابطہ جام نور میں ان کا انٹرویو چھپنا چاہیے، پتہ نہیں مولانا بہاء المصطفیٰ صاحب ان کے لیے پردے میں بھلائی کیوں سمجھ رہے ہیں؟ (شمارہ نومبر ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

مولانا حضور احمد منظری (پرنسپل دارالعلوم غوث الوریٰ، شاہ جہاں پور، یوپی)

''خامہ تلاشی'' کا کالم وہ کالم ہے کہ جب رسالہ ہاتھ آتا ہے تو سب سے پہلے میں اس کالم کو پڑھتا ہوں- ابوالفیض معینی کون ہیں، آخر کب تک آپ ان کو سات پردوں کے پیچھے رکھیں گے؟ میری ادنی سی رائے یہ ہے کہ کبھی ایک انٹرویو کے ذریعہ اپنے قارئین سے موصوف کی بھی ملاقات کرادیجئے تاکہ قارئین ''جامِ نور'' ایک دیدہ ورنقاد اور وسیع النظر و وسیع المطالعہ مبصر کے احوال زندگی سے واقف ہوسکیں- ہاں! اگر کوئی مصلحت حارج ہو یا کوئی امر مانع ہو کہ جس کے باعث آپ جناب معینی صاحب کو صیغۂ راز ہی میں رکھنا چاہتے ہیں تو پھر میں اپنی رائے واپس لیتا ہوں- (شمارہ ستمبر ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

مولانا عبدالمبین نعمانی (المجمع الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی)

عزیزم خوشتر نورانی صاحب!............السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ اپریل ۲۰۰۵ء کا ''جام نور'' نظر نواز ہوا، بڑے اچھے اچھے مضامین اس شمارے میں ہیں اور فکر انگیز بھی، ''خامہ تلاشی'' کا عنوان بھی خوب ہے اور مضمون بھی-

(شمارہ مئی ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

ماشاءاللہ جام نور یوماً فیوماً روبہ ترقی ہے، مضامین معیاری اور عصری تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں، دانشور طبقے کو اگلے شمارے کا انتظار رہتا ہے، یہ کسی جریدہ کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، خامہ تلاشی کے کالم نے اس کی افادیت اور معنویت میں چار چاند لگادیے ہیں-

(شمارہ اگست ۲۰۰۶ء)

مولانا سید قمر شاہجہان پوری (نائب قاضی شہر، کرنیل گنج کانپور، یوپی)

خامہ تلاشی میں اگر محترم ابوالفیض معینی صاحب میری نعت پر کچھ نہ تحریر فرماتے تو مجھے حیرت ہوتی، میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ انہوں نے توجہ سے میری نعت پڑھی اور اپنی رائے سے نوازا، ان کی خفیف چٹکی میری مسکراہٹ کا سبب بنی، مگر میرا شعر بلکہ دونوں اشعار درست ہیں۔ (شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء)



مولانا ملک الظفر سہسرامی (مدیر اعلیٰ سہ ماہی ''الکوثر'' بارہ دری سہسرام، بہار)

''کسوٹی'' کے تحت آپ نے ''خامہ تلاشی'' کا جو عنوان قائم کیا ہے اس کی ترکیب میری سمجھ سے بالاتر ہے خانہ تلاشی اور جامہ تلاشی کی ترکیب تو نظر سے گزری ہے خامہ تلاشی کی ترکیب شاید جدیدیت کے ذیل میں آتی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ''خام تلاشی'' ہے؟ نفس مضمون کے اعتبار سے بھی اس کی مطابقت سمجھ میں نہیں آسکی، شگفتہ تحریر اور شائستہ لب و لہجے میں گزشتہ ماہ کے شمارے کے اکثر مشمولات کو صاحب قلم نے اپنی تنقیدی بصیرت سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان سے نعتیہ ادب پر شائع ہونے والے عالمی جریدہ ''نعت رنگ'' میں علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی کا احتسابی جائزہ شائع ہوتا ہے، شاید یہ مزاج آپ نے وہیں سے لیا ہے، یہ ایک عمدہ پیش رفت ہے، لیکن جن صاحب بصیرت کی تنقیدی نگاہ نے یہ فرض ادا کیا ہے، ان سے میری واقفیت کا دائرہ صفر محض کی حد تک ہے، ممکن ہے اس میں میری ناقص معلومات کا عمل دخل ہو، پھر پتہ نہ ہونے کے سبب ان تک رسائی کی راہ بھی آپ نے مسدود کر دی۔ ممکن ہے کوئی فرضی نام ہو، اگر ایسا ہے تو پھر اس انداز کو میں صالح تنقید کے لیے مفید نہیں سمجھتا، تنقید میں اگر تنقیص کا پہلو نہیں ہے تو اسے خوش آمدید کہا جائے گا، لیکن پردے کے پیچھے رہ کر تنقید کا حق بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ قدسی کی نعتیہ شاعری پر میرے مضمون کے بعض گوشوں پر بھی تنقید نگار نے تنقید فرمائی ہے، انہوں نے اس سلسلے میں جو سوالات قائم فرمائے ہیں میں اس کے جواب سے دانستہ گریز کر رہا ہوں، جب تک تنقید نگار اپنے رخ روشن سے نقاب نہیں الٹتے، میں ان کی کسی بھی بات کا جواب تحریر کرنا غیر

مناسب خیال کرتا ہوں-(شمارہ مئی ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

مولانا منظر الاسلام ازہری (الٹا وسٹا ڈرائیو، ساؤتھ سانفرنسسکو، کیلی فورنیا، امریکہ)

مکرمی نورانی صاحب!............سلام مسنون

مئی کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے، حسب سابق تمام مشمولات قابل قدر ہیں، نئے نئے کالم کا اضافہ کرنا ''جام نور'' کی امتیازی شان ہے، یہ سچ ہے کہ کسی چہرے کو شفاف اور کسی مضمون کو غیر معمولی اہمیت کا حامل بنانے کے لیے تنقید کے مراحل سے گزارنا از حد ضروری ہے، اس اہم کام کے لیے آپ نے نہایت باشعور اور پختہ قلم کار کی خدمت حاصل کی ہے، اس پر مولانا ملک الظفر سہسرامی کا اظہار خیال بھی دلچسپی سے خالی نہیں-یقیناً قارئین جام نور کی تنقید نگار تک رسائی ہونی چاہیے، تاہم سہسرامی صاحب کی اس رائے سے مجھے اتفاق نہیں کہ وہ جواب اس وقت تک نہیں دیں گے جب تک تنقید نگار ''رخ روشن سے نقاب نہیں الٹتے'' کیونکہ جب ہماری خامیاں اجاگر ہو گئیں تو تنقید نگار کی معرفت سے کچھ مطلب نہیں رہ جاتا اور جواب دینا ہمارا فرض بن جاتا ہے، لہذا سہسرامی صاحب کو تنقید نگار کی نقاب کشائی کے بجائے جواب تحریر کرنا چاہیے-

''خامہ تلاشی'' کرتے ہوئے معینی صاحب نے انگریزی الفاظ کے استعمال کو اس وقت روا سمجھا ہے جبکہ اردو میں اس کا کوئی متبادل لفظ موجود نہ ہو، اس کی ایک مثال بھی انہوں نے پیش کی ہے اور Update Knowledge کے استعمال میں اس لیے انہیں کوئی حرج نہیں کہ اس کا کوئی متبادل لفظ اردو میں موجود نہیں، مگر میری ناقص رائے میں ''ترقی یافتہ تعلیم'' کو شاید اس انگریزی لفظ کا متبادل قرار دیا جا سکتا ہے-اداریہ پر معارضہ کرتے ہوئے موصوف مزید لکھتے ہیں کہ ''اداریہ میں تمہید کے طور پر عرب کے پسماندہ ممالک میں لائن لگانے کی جو مثال دی گئی ہے وہ ممثل لہ سے لگّا نہیں کھاتی'' عرض یہ ہے کہ خوشتر صاحب کی مثال ممثل لہ سے اگر لگّا نہیں کھاتی تو یہ معارضہ بھی نہایت بے تکا اور قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بات وہاں لائن لگانے کی تھی اور آنجناب دھکا مکی اور طوفان

بدتمیزی کی بات کررہے ہیں، اور پھر ممثل لہ سے لگّا کیوں نہیں کھاتی؟ ذرا سوچیے تو سہی کہ تشبیہ صرف اس قدر میں دکھانا مقصود ہے کہ جس طرح عرب ہر کام کے لیے لائن لگا لیتے ہیں، اسی طرح ہمارے یہاں کسی نے بھی کوئی کام کی ابتدا کی تو سارے لوگ اس کام کو کرنا شروع کردیتے ہیں، اب عربوں کے طابور میں کھڑے ہونے کا مقصد نظم وضبط ہو یا کچھ اور، بات دراصل یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''خامہ تلاش'' کا ادبی مطالعہ کافی وسیع ہے اس لیے ان کے پاس محاورے اور امثال کی بھی کمی نہیں، لہذا ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جتنا زیادہ ہوسکے وہ اپنے محاوروں کو تنقید کا روپ دیکر الفاظ میں استعمال کریں۔

(شمارہ جون ۲۰۰۵ء)



قارئین کا دل جیتنے کے لیے آپ نے ''خامہ تلاشی'' کے بھی کالم کا خوب اضافہ کیا، اس ضمن میں آپ کے مستقل کالم نگار ابوالفیض معینی صاحب بھی قابل تعریف ہیں کہ بے لاگ تنقید وتبصرہ سے بالکل نہیں چوکتے، پچھلے شمارہ میں میرے اوپر ان کی عنایتوں کا سائبان کچھ زیادہ ہی دراز ہوتا چلا گیا ہے، میرے خیال میں اب ''جام نور'' کو ''تعقبات'' کے عنوان سے ایک اور مستقل کالم کا اضافہ کرنا چاہیے جہاں ''خامہ تلاش'' کا بھرپور علمی محاسبہ کیا جاسکے، کیونکہ اظہار خیالات کے محدود صفحات اس کے لیے ناکافی ہیں۔

(شمارہ اکتوبر ۲۰۰۵ء)



گزشتہ کئی ماہ سے معینی صاحب کی خامہ تلاشی پھر اس پر ہمارے تعقبات آپ شائع کرتے آرہے ہیں، اس پر ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں، ہماری یہ تحریر بھی ان ہی سے متعلق ہے مگر خوف اس بات کا ہے کہ اس میں انہیں پھر کہیں غیظ وغضب اور غیر سنجیدہ پن کی شکایت نہ ہونے لگے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

حضرت آسی علیہ الرحمہ کے شعر سے متعلق محدث کبیر مدظلہ العالی کی آخری اور فیصلہ کن تحریر شائع کرکے آپ نے دانشمندانہ اقدام کا مظاہرہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ڈاکٹر اعظمی اور مولانا مصباحی صاحبان کے ماضی کے دیرینہ تعلقات کو برقرار رکھے۔

قارئین کی طرح ہمیں بھی معینی صاحب سے اس سلسلہ میں فیصلہ کن، منصفانہ تحریر کی توقع تھی اور ہم انہیں اب تک ایک غیر جانبدار ناقد کی حیثیت سے دیکھتے آرہے تھے، مگر اپریل ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں معینی صاحب نے مبہم مگر یک طرفہ تحریر شائع کرکے اپنی رائے کا اظہار کرنے سے شاید اس لیے گریز کیا کہ:

اک طرف ہے کوئے جاناں اک طرف ہے کوئے یار

معینی صاحب نے اس شمارہ میں حقیقت پسندی کا بھی ثبوت دیا ہے، جس پر ہم ان کی جرأت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، انہیں اپنے محدود مطالعہ کا پورا احساس ہے چنانچہ اس کے جلوے بھی ان کی اس تحریر میں جابجا نظر آرہے ہیں، مثلاً صوفیہ کرام کی طرف انہوں نے ''نکذب لہ لا علیہ'' جیسے کلمات کا انتساب کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسئلہ سے متعلق اگر اسلام کا مفاد وابستہ ہو تو صوفیہ کرام حدیثیں گڑھنے میں تأمل نہیں کرتے، محترم حیدرآباد جیسے ثقافتی شہر کے بارے میں یہ گمان کرنا تو بے سود ہوگا کہ وہاں کی لائبریریوں میں تدریب الراوی جیسی مشہور ومعروف کتاب موجود نہیں ہے، اگر بالفرض وہاں نہیں تھی تو رامپور یا پٹنہ کا سفر کرلیں، مطالعہ بہت حد تک وسیع ہوجائیگا، ڈاکٹر صاحب کی تحقیق سے اہل سنت کے جذبات مجروح ہوئے یا نہیں یہ تو ہمیں نہیں معلوم، البتہ آپ نے جس جرأت رندانہ کا مظاہرہ کیا ہے اس سے اہل سنت کے جذبات کو ضرور ٹھیس پہونچے گی، چنانچہ آپ نے جس جملہ کی نسبت صوفیہ کرام کی طرف کی ہے وہ اصل میں گمراہ فرقہ ''کرامیہ'' کا قول ہے، صوفیہ کرام کا نہیں، دیکھئے: تدریب الراوی، جلد۱، ص:۲۸۳، مکتبہ علمیہ، مدینہ منورہ۔ (شمارہ جون ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

مولانا نعمان اعظمی ازہری (مرکز اہل سنت برکات رضا، پوربندر، گجرات)

آپ کا ہر انداز روایت شکن اور نرالا ہوتا ہے، آپ نے فکر ونظر اور تحقیق وتنقید کی جو شمع روشن کی ہے اس کی ضوفشانی قابل دید ہے، بالخصوص آپ کے خامہ تلاش ابو الفیض معینی صاحب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، انہوں نے تنقید کو اصلاحی اور تعمیری رنگ دے کر ہمیں نقد ونظر کے ایک نئے جہان کی سیر کروائی ہے وہ کبھی بے بنیاد اعتراض یا خوامخواہ کی تنقید سے قلم کا وقار مجروح نہیں کرتے، وہ جب بھی تنقید کرتے ہیں تو نہایت شائستگی اور سلیقہ کے ساتھ کرتے ہیں، ان کے انداز تنقید میں کسی کی دل شکنی، توہین یا تحقیر کا شائبہ تک نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان کی بہت ساری گرفتوں اور اصلاحوں کو اہل قلم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا ہے۔ (شمارہ جون ۲۰۰٦ء)

❑❑❑

ایم ایچ ہما (صدر شعبۂ اردو، مرار کا کالج، سلطان گنج، بھاگلپور، بہار)

''خامہ تلاشی'' کا عنوان قائم کر کے آپ نے قارئین کے سر سے بوجھ تھوڑا ہلکا کر دیا ہے، ورنہ ادبی رسالوں میں یہ کام زیادہ تر خطوط کے کالم سے لیا جاتا ہے۔

(شمارہ اگست ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

محمد افروز قادری (ڈائرکٹر، نعمانی اکیڈمی چریا کوٹ، ضلع مئو، یوپی)

ابو الفیض معینی صاحب کی خامہ تلاشی خوب ہے، وہ بہت اچھا لکھ لیتے ہیں، اتنا اچھا کہ کبھی کبھی مجھ میں حسد کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے کہ وہ اتنا اچھا کیوں لکھتے ہیں اور سودائے رشک تو برابر سر میں سمایا رہتا ہے کہ میں اتنا اچھا کیوں نہیں لکھ پاتا، اتنی کامیاب خامہ تلاشی کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خامہ تلاشیوں نے نکات کے شہر میں نئے آفاق روشن کیے ہیں اور ''کسوٹی'' نے نہ صرف میرے لیے بلکہ ایک جہاں کے لیے علم ومعرفت کے دروا کیے ہیں اور گوناگوں معلومات کی نہریں بہا دی ہیں، اس سلسلہ کی درازی کے لیے تہ دل سے ڈھیروں دعائیں۔

اس میں بھی دورائے نہیں کہ ابو الفیض معینی اب ایک ایشیا گیر معمہ بن چکا ہے اور خامہ

تلاش کی تلاش کا احساس اب اس قدر توانا ہو گیا ہے کہ بدگمانیاں راہ پانے لگی ہیں، موصوف اپنے نام کے ساتھ وفا کرتے ہوئے اپنی شناخت کا معتبر حوالہ پیش کر دیں تو اچھا ہے ورنہ ہم قارئین ڈاکٹر شکیل اعظمی، مولانا آل مصطفیٰ مصباحی اور ظہیر غازی پوری سمیت کتنی الجھنوں میں پابجولاں رہیں گے۔

قیافہ آرائی کا عالم یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ تک کہنے لگے ہیں کہ ابوالفیض معینی کوئی جن ہے جو اپنی تمام تر فیض بخشیوں کے ساتھ خوشتر نورانی پر سواری لیتا ہے اور سود وزیاں کا ہر نقش ابھار کر پیش کر دیتا ہے۔ (شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

قاری محمد انظر القادری (قاری کتاب گھر، شاہ عالم احمد آباد، گجرات)

ابوالفیض معینی صاحب کا لکھا ہوا ہر شمارہ پر بے لاگ تبصرہ بھی خوب ہوتا ہے، اس سے رسالہ کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے، آپ سے عرض ہے کہ ابوالفیض معینی صاحب کو خامہ تلاشی کے لیے کچھ صفحات اور بھی عطا کر دیں کیونکہ تین صفحات سے تشنگی دور نہیں ہوتی اور بڑھ جاتی ہے، ابوالفیض معینی صاحب کو بھی میری طرف سے ہر شمارے پر علم وفن میں ڈوبا ہوا بے لاگ اور بے باک تبصرہ پر بہت بہت مبارکباد پیش کر دیجیے۔ (شمارہ ستمبر ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

ظفر نعمانی (ذکی شہید، سہسرام ضلع روہتاس، بہار)

تازہ شمارے میں مراسلات کے باب میں محمد ناصر صاحب کی ایک تحریر نظر سے گزری جو خیر سے اردو کے ثقافتی علاقے سے وابستگی کا شرف بھی رکھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں ''معینی صاحب کی علمی و ادبی دھمک ہند و پاک میں یکساں طور پر محسوس کی جا رہی ہے، پھر میرا اعتراف بھلا کس درجہ میں ہے چنانچہ مجبوراً اعتراض کی راہ اختیار کرنا پڑی''، گویا مراسلہ نگار نے اپنی انفرادی شناخت قائم کرنے کے لیے اعتراض کی راہ اختیار کی یا للعجب! اور پھر طرفہ یہ کہ تذکیر و تانیث کے اعتبار سے جو اعتراض کیا گیا ہے وہ آں جناب کے ماہر لسانیات ہونے کی چغلی کھا رہا ہے، ممکن ہے رامپور و مضافات میں ''کنکر'' مؤنث مستعمل ہو، تاہم

اس سے اردو زبان وادب کا جو ایک عام لسانی منہج ہے وہ تبدیل نہیں ہوسکتا۔

کیا کہوں کیسے وہ گھبرائے میں بیٹھے بیٹھے
میں نے شب گھر میں جوان کے کوئی کنکر مارا

آپ کے خامہ تلاش، خام تلاشی میں بہت پختہ کار اور منجھے منجھائے کھلاڑی ہیں، زبان و بیان پر خاصی دسترس رکھتے ہیں، دینی وعصری علوم کی مختلف شاخوں پر ان کی وسعت مطالعہ کے نقوش روشن ہو چکے ہیں۔ یوں کوئی تنقید نگار بننے کے شوق میں یا پھر انفرادی شناخت قائم کرنے کے چکر میں ان سے لسانی معرکہ آرائی کے لیے تیار ہو تو الگ بات ہے۔
(شمارہ مئی ۲۰۰۶ء)



فیصل مغیثی بغدادی (دارالعلوم نورالحق چرہ محمد پور، فیض آباد، یوپی)

مکرمی خوشتر صاحب!......آپ کا کثیر الاشاعت ماہنامہ ''جام نور'' (فروری ۲۰۰۶ء) عصری تقاضوں سے ہم آہنگ، رنگا رنگ مضامین سے سجا ہوا، دیدہ زیب سرورق کے پیرہن میں ملبوس باصرہ نواز ہوا، جس کے خزینۂ معرفت کے کالم میں مولانا ''اسید الحق'' صاحب زیدحبہ کا حاصل مطالعہ ''علامہ یوسف القرضاوی اور جماعت سلفیہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، مضمون پڑھ کر دل نے چاہا کہ اس سے متعلق کچھ تاثرات ضرور تحریر کیے جائیں مگر پھر معاً خیال آیا کہ اس ماہنامہ کے کسی مضمون پر کچھ تنقید وتبصرہ کرنے سے پہلے آئندہ شمارہ کا انتظار کر لینا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ آپ نے خود ہی ''ابوالفیض معینی'' جیسے بے لاگ مبصر اور شفاف ناقد کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو نہایت ہی پابندی کے ساتھ حسب حاجت ہر مضمون کی ''خامہ تلاشی'' کرتے رہتے ہیں، یقیناً وہ آئندہ شمارہ میں اس مضمون پر بھی کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی ضرور فرمائیں گے، لیکن مارچ کا شمارہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ محترم نے مولانا بدایونی کے ''حاصل'' پر قارئین کا دل چسپاں کر کے خاموشی اختیار کر لی ہے اور اس سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے، اب یہ تو وہی بتا سکتے ہیں کہ ان کی جستجو کی استعداد کمزور ہے یا طرفداری خاطر نے کمزوری عیاں کر دی ہے؟ بہر حال اب تو آپ کے

خامہ تلاش کی جامہ تلاشی بھی ناگزیر ہوتی جارہی ہے، کیونکہ یہ حاصل مطالعہ کچھ ایسی لا حاصل باتیں ساتھ لایا ہے جنہیں نظر انداز کیا جانا کسی دانا و بینا کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔(مئی ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

سید منظر چشتی (خانقاہ عالیہ صمدیہ، پھپھوند شریف، ضلع اوریّا)

جولائی کے شمارہ میں خاکسار کی نعت بعنوان ''میں سرزمین مدینہ تلاش کرتا ہوں'' شائع فرمانے کا شکریہ۔

سچ تو یہ ہے کہ جتنا نعت کے شائع ہونے کا انتظار تھا اس سے کہیں زیادہ نعت پر تبصرہ کا انتظار رہا، مگر جب اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا تو مایوسی ہوئی، حقیقت تو یہ ہے کہ میری طرح اکثر قارئین کو شمارہ کے دیگر مشمولات سے زیادہ ''خامہ تلاشی'' کا بڑی بے صبری و بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ میں منتظر تھا کہ معینی صاحب بھرپور تنقیدی روشنی ڈال کر معائب و محاسن کو اجاگر کریں گے اور مجھے فن کو نکھارنے میں مدد ملے گی، لیکن انہوں نے یہ موقع عنایت نہ کیا۔ (شمارہ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

❑❑❑

محمد رضوان عالم نوری (منظور پورہ، نئی سڑک، اورنگ آباد، مہاراشٹر)

مجھے حیرت ہے تو جناب ابوالفیض معینی صاحب پر کہ وہ اس (ڈاکٹر شکیل اعظمی اور مفتی آل مصطفیٰ صاحب کے) معاملہ میں (انہی کے الفاظ میں) اوگفت اور آنہا گفتند کا اسلوب اپنا کر محض خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، قارئین ہمیشہ ان سے دوٹوک، فیصلہ کن اور بے لاگ تبصرہ کی توقع کرتے ہیں، بلکہ ایسے نازک مباحث میں ہم انہیں ''حکم'' کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، لہٰذا ان کی خاموشی ان کی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کو شکوک وشبہات کے دائرہ میں لا کھڑا کرے گی۔ (شمارہ فروری ۲۰۰۶ء)

❑❑❑

محمد نعیم برکاتی (قول پیٹ، ہبلی، کرناٹک)

محترمی خوشتر نورانی صاحب! عرض یہ کہ کل ہی مجھے ماہنامہ جام نور کا شمارہ مارچ

۲۰۰۶ء ملا- اس میں ایک سلسلہ ’’خامہ تلاشی‘‘ کے عنوان سے جو شروع کیا گیا ہے، خصوصاً قلم کار حضرات کے لیے ایک بہت ہی اہم سلسلہ ہے کہ یہ اس رسالہ کے حسن و جمال کو نکھارنے اور اس کا معیار بلند کرنے کے علاوہ مضمون نگار کو اپنی نگارشات میں سدھار لانے، کھرے کھوٹے کی پہچان کرانے اور صحیح و غلط یا حق و ناحق میں تمیز کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے- ویسے اس کالم کی جانب اب تک تو میں یہ سوچ کر بالکل توجہ نہیں دیتا تھا کہ اس میں تو سوائے تنقید کے کچھ نہیں ہوتا، لیکن اس بار کے شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء میں کسوٹی کے کالم میں اسے ایک نظر ملاحظہ کیا تو فوراً خیال آیا کہ دیکھیں کہ ستمبر ۲۰۰۵ء کے شمارہ میں شخصیات اسلام کے تحت اپنا ایک مضمون ’’امام الفقہاء وسید القرا‘‘ جو شائع ہوا تھا، اس کے متعلق جناب ابوالفیض معینی صاحب نے کیا ’’خامہ تلاشی‘‘ لی ہے؟ تو فوراً ہی میں نے اکتوبر ۲۰۰۵ء کا شمارہ اپنی فائل سے نکالا اور اس کے صفحہ ۵۴ پر ان کی یہ تنقید ملاحظہ کی:

’’محترم برکاتی صاحب لکھتے ہیں کہ خلیفۂ سوم حضرت سیدنا عثمان غنی کے دور خلافت میں بھی یہ منصب عظیم (یعنی منصب افتاء) ان کو حاصل رہا، پھر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان نے اپنے دور خلافت میں جامعین قرآن کی مجلس کا رئیس حضرت ابی بن کعب کو مقرر فرمایا، یہ دونوں باتیں اس وقت درست ہوں گی جب یہ ثابت کر دیا جائے کہ حضرت ابی بن کعب خلافت عثمانی میں بھی باحیات تھے، حالانکہ آگے چل کر خود برکاتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ’’ حضرت ابی بن کعب نے مدینہ منورہ میں ۱۹ھ میں یعنی خلافت فاروقی میں وفات پائی اور جب آپ کی وفات ہوئی تو حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ آج سید المسلمین وفات پا گئے- اب یہ معمہ تو محترم نعیم برکاتی کو ہی حل کرنا ہے- الخ-‘‘

اس نشاندہی کے متعلق جناب ابوالفیض معینی صاحب کا میں شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس جانب میری توجہ مبذول کرائی، واقعی صحیح کسوٹی میں انہوں نے مجھے کس دیا ہے، کیونکہ مضمون لکھتے وقت اس جانب میری توجہ بالکل نہیں گئی، ورنہ اُسی وقت اس کی وضاحت بھی کر دیتا-

(شمارہ اپریل ۲۰۰۶ء)

پردہ اٹھتا ہے

انٹرویو

مدیر جام نور کی ابوالفیض معینی سے ملاقات

مشہور علمی نقاد کلیم الدین احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیائے ادب میں ایسے داخل ہوئے جیسے کوئی مست ہاتھی شیشے کی دکان میں داخل ہو جائے، حالانکہ سچائی یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ دماغ اور باشعور انسان تھے، ہاں! ان کا انداز جنونی ضرور تھا، جس کی وجہ سے متنازعہ ہی نہیں مطعون بھی ٹھہرے۔ ہم نے جب محترم ابوالفیض معینی کو جام نور کے تین صفحات کی مطلق العنانی سونپی تو اس قسم کے خدشات ہمیں بھی دامن گیر ہوئے کہ ایسی زمین پر جہاں جمہوری طرز پر اظہار خیال کی آزادی کا گلا بھی گھونٹ دیا گیا ہو وہاں اس قسم کی مطلق العنانیت کو لوگ کیسے برداشت کر سکیں گے؟ لیکن اس اتفاق کو کیا کہیے کہ ہمارا اندازہ یکسر غلط ثابت ہوا، خامہ تلاشی کی ایسی پذیرائی ہوئی گویا معینی صاحب تنقید نہیں قارئین اور قلم کاروں کا قصیدہ لکھ رہے تھے جن کے حضور محبتوں کا خراج پیش کرنے کے لیے لوگ بے قرار تھے، تنقید پر ایسی تحسین اس کے تعمیری ہونے کی آخری دلیل ہے اور اس بات کا اشاریہ ہے کہ ابوالفیض معینی کا ہوش جوش پر غالب تھا اور ان کی ذات پندار علم سے محفوظ۔ اول روز سے ہی اک شور اٹھا کہ "ابوالفیض معینی کے چہرے سے نقاب اٹھائی جائے"، ہم اسے مسلسل نظر انداز کرتے رہے اور جب ڈھائی سال کے بعد اس کالم کے بند ہو جانے کے بعد بھی یہ شور نہ تھم سکا تو ہم قارئین کو یہ بتانے پر مجبور ہو گئے کہ ابوالفیض معینی کوئی اور نہیں جام نور کے محقق قلم کار، خانوادۂ عثمانیہ بدایوں کے چشم و چراغ، فاضل ازہر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کا ہی دوسرا نام ہے جن کی شخصیت مزید تعارف کی محتاج نہیں۔ لیجیے ابوالفیض اسید الحق قادری معینی سے باتیں کیجیے

خوشتر نورانی

خوشتر نورانی :-آج سے تقریباً ڈھائی سے قبل ممبئ کے سفر سے واپسی پر آپ دہلی جام نور کے دفتر میں تشریف لائے تھے،اس ملاقات میں میں نے آپ کے سامنے کالم ''خامہ تلاشی'' کا خاکہ پیش کیا اور اسے شائع کرنے کی تجویز رکھی تھی- اس میں کوئی دورائے نہیں کہ جام نور کے ہر شمارے پر تنقید وتبصرہ کرنے کا خیال نعتیہ ادب کا عالمی جریدہ ''نعت رنگ'' کو دیکھ کر آیا،جس میں عالم اسلام کے مشہور اسکالر مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی نعت رنگ کے ہر شمارے پر تبصرہ فرماتے ہیں-نعت رنگ تو ایک خاص موضوع پر نکلتا ہے اور جام نور کا کوئی ایک خاص موضوع نہیں ہے، بلکہ یہ بیک وقت دینی، مذہبی، سیاسی اور ادبی موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے-اب میرے لیے پریشانی یہ تھی کہ جام نور پر تنقید وتبصرہ کرنے کے لیے ایسی شخصیت کہاں سے لائی جائے جو بیک وقت زبان وادب پر بھی اچھی نگاہ رکھتی ہو،مختلف علوم اسلامیہ پر بھی اچھی دسترس رکھتی ہو،شعروسخن کا بھی اچھا ذوق رکھتی ہو اور عروض وقوافی سے بھی آشنا ہو- اس پریشانی کی وجہ سے اس کالم کے اجراء کا خیال دل سے نکال ہی دینا چاہتا تھا کہ اچانک آپ کا خیال دل میں آیا اور مجھے محسوس ہوا کہ اب میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے، بہر حال یہ تو اس کالم کا شروعاتی پس منظر تھا، یہ کہانی ایک طویل مضمون کا تقاضا کرتی ہے،اس سے قطع نظر اس کالم کی کامیابی کے تعلق سے جتنا میں نے سوچا تھا،میری سوچ سے کہیں زیادہ اسے کامیابی ملی اور مذہبی صحافت کی تاریخ میں اس نے ایک نیا باب لکھ دیا- آج جب کہ آپ کی اصل شخصیت ہمارے قارئین کے سامنے آ چکی ہے،آپ ہمارے قارئین کو یہ بتائیں کہ جب میں نے آپ کے سامنے اس کالم کی تجویز رکھی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟

ابوالفیض معینی :- مجھے یاد ہے کہ جب آپ سے دہلی میں جام نور کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو آپ نے کہا کہ جام نور میں ہمیں کسی ایسے کالم کی شروعات کرنی چاہیے جو بالکل نیا اور انوکھا ہو اور پھر مولانا کوکب نورانی صاحب کے نعت رنگ میں شائع ہونے والے ان خطوط کا ذکر کیا- جہاں تک کوکب نورانی صاحب کی بات ہے، میں ان کی ذات سے،ان کے قلم سے اور ان کی شخصیت سے خود بھی بہت متاثر ہوں- مجھے ایسا نہیں لگا کہ جو

کام کوکب صاحب نے بحسن وخوبی انجام دیا تھا، مجھ جیسا کم علم آدمی وہ معیاری کام کر سکے گا- حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ابتداً میں اس کام کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا، اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ میں خود کو ایک ایسے کام کے لیے جس میں ایک ذمہ دار اور بہت وسیع المطالعہ شخص ہونا چاہیے اور کم از کم میں اپنے آپ کو اس معیار کا گمان نہیں کرتا تھا-

خوشتر نورانی :-مگر اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے تعلق سے آپ کی اس وقت یہ خاکساری اور انکساری تھی؟

ابوالفیض معینی:- (مسکراتے ہوئے) نہیں! بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ آپ کا حسن ظن تھا کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے کہ جو ذمہ داری آپ نے مجھے دی تھی اسے اپنی وسعت بھر انجام دینے کی کوشش کی- اس کالم کو شروع کرنے میں مجھے جو پس وپیش تھی وہ یہ کہ ظاہر ہے کہ یہ تنقید کا کالم تھا، مجھے جام نور کے تمام مشمولات کو پڑھ کر ان پر تنقید کرنی تھی، جام نور کثرت کے ساتھ جن حلقوں میں پڑھا جاتا ہے وہاں تنقیدی شعور ابھی اتنا بیدار نہیں ہوا تھا کہ لوگ صالح، مثبت اور تعمیری تنقید کو بھی برداشت کر پاتے بلکہ بسا اوقات اسے تنقیص پر محمول کر لیتے، اس لیے اس خارزار وادی کا مجھے پورا احساس تھا کہ جب میں تنقید کروں گا تو مجھے لعنت و ملامت ملے گی- لیکن جب بہت غور کیا تو مجھے لگا کہ اگر اس کو شروع کیا جائے تو اس کے ذریعے سے ہم اپنی جماعت میں، مذہبی صحافت میں اور اردو صحافت میں بھی ایک نئی جہت اور نیا افق دکھا سکتے ہیں، لہٰذا آپ کی محبت تھی کہ میں تیار ہوا اور اس کالم کو شروع کیا اور پھر اس کے بعد خاص طور پر میں یہ بات کہنا چاہوں گا کہ آپ کے قارئین نے جس طرح مجھے پسند کیا، خطوط کے ذریعے، فون پر آپ کے ذریعے اور آپ سے نجی ملاقاتوں میں، جس کے لیے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اتنی حوصلہ افزائی، اس قدر پذیرائی کی کہ ان کے ہر آنے والے خط یا فون کے بعد میرا حوصلہ بڑھتا چلا گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ جو تنقید میں کر رہا ہوں قارئین اسے پسند کر رہے ہیں- دراصل اس کام کو شروع کرنے سے پہلے بھی جب میں جام نور پڑھتا تھا تو بہت سی ایسی باتیں نظر سے گزرتی تھیں اور طبیعت چاہتی تھی کہ ان پر کچھ لکھوں اور ان کی

اصلاح کر دی جائے ، اس کالم نے وہ مواقع دیے اور پھر ہماری کوشش رہی کہ جو کچھ بھی قارئین کے پاس جائے وہ صاف ستھری جائے۔

خوشتر نورانی :- یہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے قارئین یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ آپ نے اپنا اصل نام اور شناخت کیوں چھپائی تھی؟ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سلسلے میں میری ذاتی رائے تو یہ تھی کہ آپ اپنے اصل نام سے ہی لکھیں اور اپنی پہچان نہ چھپائیں، لیکن آپ سے مختلف وقتوں میں ملاقاتیں ہوئیں اور فون پر بھی باتیں ہوئیں جس میں آپ نے کہا کہ نام کو پوشیدہ رکھنا ہی مناسب ہے، پھر میں نے بھی آپ کی بات سے اتفاق کر لیا۔ ہمارے قارئین کو آپ ضرور بتائیں کہ اس کے پیچھے آخر کیا مصلحت تھی؟

ابوالفیض معینی :-اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو میں کم از کم اپنے نام کے ساتھ نہیں لکھ سکتا تھا- آپ کو معلوم ہے کہ میرا اپنا ایک خاندانی پس منظر ہے، اپنی ایک تاریخ ہے اور اپنا ایک میدان ہے، اپنی ان تمام شناختوں کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کو میں نہیں کہہ سکتا تھا، دوسری بنیادی وجہ یہ تھی جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ چونکہ ہمارے یہاں تنقیدی شعور ابھی اتنا بالغ نہیں ہوا ہے، اگر میں اپنے نام کے ساتھ تنقید کرتا تو ردعمل اچھا نہیں ہوتا- مثلاً اگر میں کسی کی غلطی پر جائز تنقید کرتا تو بھی وہ ذاتیات اور شخصیات پر آ جاتا اور اگر کوئی ایسی شخصیت تنقید کرتی ہے جس کا کوئی تعارف نہیں ہے تو پھر اسے ذاتیات اور شخصیات پر حملے کے لیے کوئی سرا نہیں ملے گا، بالکل میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، میرا تعارف نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے والے مجھ تک نہ پہنچ سکے- اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ایک فرضی سا نام ہو، اگر بالفرض اس فرضی نام کو لے کر کوئی کچھ کہتا بھی ہے تو اس کی بات صدا بہ صحرا ہو کر رہ جائے گی- آپ نے یہ درست فرمایا کہ آپ کا شدید اصرار بھی تھا کہ میں اپنے نام سے لکھوں اور ہم نے اپنے جام نور ٹیم کے احباب سے مشورہ بھی کیا تو مجھے یاد ہے کہ ان میں سے دو تین لوگوں کا شدید اصرار تھا کہ میں سامنے آؤں-

خوشتر نورانی :-اب جب کہ آپ کی شخصیت سامنے آ ہی گئی ہے تو ان احباب کا بھی آپ نام لے سکتے ہیں جنھوں نے اس کے لیے اصرار کیا تھا-

ابوالفیض معینی :-جیسا کہ ہمارے کرم فرما مولانا ملک الظفر سہسرامی جو جام نور کے مستقل قلم کار ہیں اور ہمارے بڑے اچھے دوست ہیں ان کا بھی یہی فرمانا تھا کہ آپ اپنے نام سے اس کو لکھیے اور چونکہ یہ ایسی تاریخ بننے جا رہی ہے جسے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے، انھوں نے کہا کہ جب تنقید کرنے والا سامنے نہ ہو، اس کا معیار اور اس کا قد سامنے نہ ہو، اس کی تنقید کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی - مجھے ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہوا، کیونکہ آدمی کو بات دیکھنی چاہیے کہ کہنے والے کی بات کتنی باوزن ہے — یہ طے ہو جانے کے بعد کہ اپنے اصل نام سے نہ لکھا جائے، اب دوسرا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ نام کا انتخاب کیا کیا جائے اور اس میں پتہ کہاں کا ہونا چاہیے، ظاہر ہے کہ مجھے اپنا پتہ دینا نہیں تھا- آخر میں ابو الفیض معینی پر اتفاق ہوا، ابوالفیض معینی میرا اپنا نام نہ سہی، لیکن بالکل فرضی بھی نہیں بلکہ حیدرآباد میں اس نام کا میرا ایک بھتیجہ ہے جو کمپیوٹر انجینیر ہے، اس کے گھر کا نام زاویہ قادریہ ہے اور یہ نام پلّی میں ہی واقع ہے- بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس نام کی کوئی عمارت حیدرآباد میں نہیں ہے، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ زاویہ قادریہ نام پلّی حیدرآباد میں ہے-اس نام اور پتے کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ یہ شہر ہمارے یہاں سے کافی دور ہے اور لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوگی اور ہمارا کام بھی ہوتا رہے گا-

خوشتر نورانی :-اس کالم کو شروع کرنے کے بعد اہل سنت و جماعت کی طرف سے آپ کو کسی غیر مناسب ردعمل کا خطرہ تھا؟

ابوالفیض معینی :-ظاہر ہے کہ اتنا تو میں نے محسوس کیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے جام نور میں اور اس سے باہر بھی ہم نے دیکھا تھا کہ خطوط کے کالم میں یا کبھی اظہار خیالات کے کالم میں کہ اگر کسی کی غلطی پر گرفت کی گئی تو اس کے جواب میں پھر ان لوگوں نے غیر سنجیدہ اسلوب اختیار کیا، بعض کو آپ نے شائع بھی کیا اور بعض کو غیر اہم سمجھ کر شائع نہیں کیا، اس لیے مجھے اندازہ تھا کہ ردعمل تو کچھ ہونا ہے- اچھا! ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہمارے سامنے اگر کوئی بہت بڑی شخصیت ہے یا کوئی بڑا نام ہے تو اس پر تنقید کرنا ایک مشکل کام تھا اور یہ مجھے مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ اگر کوئی چھوٹا موٹا آدمی غلطی

کرے تو اس کی گرفت ہم کرلیں اور اگر خدانخواستہ کوئی سہو یا غلطی کسی بڑی شخصیت سے ہو تو اس کو چھوڑ دیا جائے، کم از کم میں اس کے لیے تیار نہیں تھا، اس کے لیے میری شرط یہی تھی کہ کوئی بھی شخص ہو حتی کہ میں نے آپ سے بھی یہی کہا تھا اور وعدہ بھی لیا تھا کہ میں آپ کے اداریے کو بھی تنقیدی نظر سے پڑھوں گا اور آپ کے اداریے میں مجھے جو بھی نظر آئے گا تاریخی، علمی، لسانی، ادبی، تحقیقی تو میں اس پر ضرور تنقید کروں گا اور آپ کو اسے شائع بھی کرنا پڑے گا- اور میں یہاں اس بات کا بھی بڑی خوشی سے اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس پورے دو ڈھائی برسوں میں آپ کی جس تحریر پر جو بھی تنقید کی تو یہ آپ کی بہر حال اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی ہے کہ آپ نے بغیر کسی ترمیم کے اس کو من وعن شائع کیا-

خوشتر نورانی :- ہمارے یہاں عام رجحان یہ ہے کہ تنقید اچھی چیز نہیں ہے تو کیا یہ رجحان صحت مند ہے؟

ابوالفیض معینی :- تنقید کا معنی یا مفہوم نہ سمجھنے کی بنیاد پر ہی یہ رجحان پیدا ہوتا ہے، جہاں تک میرے ناقص علم میں ہے کہ تنقید کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ کسی تحریر کی کوئی خامی ڈھونڈھی جائے بلکہ ہم نے یہ پڑھا ہے کہ تنقید کا مطلب ہے حسن اور قبح کا اظہار، کوئی بھی شعری یا نثری تحریر ہے، اس میں جو خوبیاں ہیں ان کو اجاگر کیا جائے اور اس میں اگر کوئی خامی ہے تو اس کو بھی اجاگر کیا جائے، تو چونکہ تنقید ان دونوں چیزوں کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ جب ہم حسن کا اظہار کر رہے ہیں جس میں تنقیص کا کوئی پہلو ہے نہیں تو جب قبح کو اجاگر کیا جا رہا ہے تو اس میں تنقیص کیسی؟ ہاں! اس میں تنقیص اس وقت پیدا ہوگی جب اسلوب اظہار ہمارا حقارت آمیز ہوگا- یاد رکھیں کہ کسی بھی صحت مند تنقید کے لیے اسلوب بھی آپ کا مثبت، ناصحانہ اور اچھا ہونا چاہیے تاکہ محسوس ہو کہ آپ کی نیت صالح ہے اور تنقید جس نیت سے کی جا رہی ہے وہ خالص تعمیری ہے- میں سمجھتا ہوں کہ تنقید کے خلاف منفی رجحان اس لیے پیدا ہوا کہ ہمارے یہاں مذہبی صحافت میں غالباً اچھے نقاد نہیں پیدا ہو سکے، تنقید کے نام پر ہمارے یہاں جو بھی لکھا گیا میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ تر تحریریں تحقیر یا تنقیص پر مبنی تھیں، میں نے جتنا بھی مطالعہ کیا اس سے مجھے نہیں لگا کہ یہ تنقید مثبت اور تعمیری بنیادوں

پر قائم ہے۔

جب بات اسلوب کی آئی ہے تو ایک اور بات بتا دوں کہ خامہ تلاشی شروع کرنے سے پہلے میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تنقید پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کو پڑھا جائے، اس سلسلے میں میں نے کوکب نورانی صاحب کے وہ سارے تنقیدی خطوط پڑھے جو انہوں نے نعت رنگ کے لیے لکھا تھا، ''فاران'' کے ایڈیٹر مولانا ماہر القادری صاحب کو پڑھا جنہیں تنقید پر ملکہ حاصل تھا، ان کے علاوہ ادبی حلقوں سے بھی میں نے کافی استفادہ کیا خاص طور پر ''خامہ بگوش'' کو میں نے پڑھا، ان سب کے مطالعے کے بعد میں نے خامہ تلاشی لکھنے کے دوران دو چیزوں کے التزام کرنے کا اپنے آپ سے عہد کیا تھا۔ پہلی چیز تو یہ کہ جب تک واقعی کوئی غلطی نہیں ہوگی اس وقت تک ہم اس کی گرفت نہیں کریں گے، پوری تحقیق اور ریسرچ کے بعد جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ واضح اور بڑی غلطی ہے جبھی ہم اس پر قلم اٹھائیں گے اور چھوٹی موٹی فروگزاشتوں کو نظر انداز کر دیں گے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ جن لوگوں پر میں نے تنقیدیں کیں انہوں نے نہ صرف اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا بلکہ اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے میرا شکریہ بھی ادا کیا۔ دوسری چیز جس کا میں نے عہد کیا تھا کہ میرا اسلوب بہت شگفتہ اور اچھا ہونا چاہیے، اس میں کہیں بھی تنقیص یا تحقیر نہیں ہونی چاہیے، جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ ان دو چیزوں کے التزام کی حتی الامکان میں نے کوشش کی اور میں سمجھتا ہوں کہ قارئین بھی ان دونوں باتوں کے سلسلے میں میری تائید کریں گے کہ میں نے ان ڈھائی برسوں کے اندر کم از کم اپنی حد تک یہ کوشش کی کہ میرے کسی جملے یا کسی لفظ سے کسی بھی اہل قلم، عالم دین اور فاضل و محقق کی دل آزاری نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ اکابر پر بھی میں نے لکھا، ایک طرف ان کی بڑی شخصیت تھی اور دوسری طرف میں ان کے سامنے کافی چھوٹا اور بچہ تھا، پھر بھی اپنی ان تمام تر کم علمی اور بچپنے کے باوجود ان کے قد کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے بہت ناپ تول کر ایسے جملوں میں تنقید کی کہ شاید انہوں نے بھی پڑھ کر مجھے دعائیں دی ہوں گی اور انہیں اچھا لگا ہوگا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تنقید کا اصل حسن وہ ہے کہ جس پر تنقید کی جائے، اس کو بھی وہ بھلا لگے تو میں نے

بھی ایسی ہی تنقید کی کوشش کی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مجھے کافی کامیابی ملی- یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ نادانستہ یا غیر شعوری طور پر میرے کسی جملے سے آپ کے کسی قاری، قلم کار یا ہمارے اکابر میں سے کسی کی ذرا بھی دل آزاری ہوئی ہو یا ان کو اپنی ہتک کا احساس ہوا ہو تو میں نہایت کھلے دل سے اپنی اس غلطی پر معذرت خواہ ہوں-

خوشتر نورانی -یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے اور ایک ذی علم صاحب قلم سے یہی توقع ہوتی ہے کہ اپنے اندر عاجزی وانکساری لائے-

ابوالفیض معینی:-میری نیت غلط نہیں تھی، میں انسان ہوں، ممکن ہے غلطی سے کہیں کچھ ہو گیا ہو-

خوشتر نورانی:- خامہ تلاشی سے جام نور، خاص طور پر قلم کاروں اور ہمارے ان طلبہ کو جو مدارس میں پڑھتے ہیں کیا فائدے ہوئے؟

ابوالفیض معینی :- جہاں تک آپ کا یہ سوال ہے خامہ تلاشی سے جام نور کو، قلم کاروں کو اور طلبہ کو کیا فائدے ہوئے؟ سب سے پہلے تو جام نور کو فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے بہت سے قارئین ایسے تھے کہ شمارہ جب آتا تھا تو پورا نہیں پڑھتے تھے لیکن اگلے مہینے جب وہ خامہ تلاشی پڑھتے تھے اور خامہ تلاشی میں کسی مضمون پر تنقید ہوا کرتی تھی تو اس کو پڑھنے کے بعد پچھلے ماہ کا شمارہ نکال کر اس مضمون کو پڑھتے تھے، اس کے علاوہ خامہ تلاشی کی وجہ سے قارئین کی دلچسپی بڑھ گئی کہ اب اگلے ماہ کیا آ رہا ہے؟ جہاں تک بات اہل قلم کی ہے میں ان کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی اصلاح کی ہے، وہ فاضلین ہیں، ہمارے بڑے ہیں مگر کم از کم خامہ تلاشی سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ وہ بہت محتاط ہو گئے، جب تک وہ لوگ علمی، لسانی اور تحقیقی جہتوں سے اپنی تحریروں کو پڑھ کر مطمئن نہیں ہو جایا کرتے تھے تب تک جام نور میں شائع کرنے کے لیے نہیں بھیجتے تھے-

خوشتر نورانی :- میں بحیثیت مدیر یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ بہت سے ایسے اہل قلم جو نو آموز تھے اور جنہیں ابھی اپنی تحریروں کی صحت پر پوری طرح اعتماد نہیں تھا، وہ جام نور میں اکثر اپنی تحریریں نہیں بھیجا کرتے تھے صرف یہ کہہ کر کہ خامہ تلاشی سے ہمیں ڈر

لگتا ہے،اس سے میں سمجھتا ہوں کہ جام نور کو مزید فائدہ یہ پہنچا کہ اس میں انہی قلم کاروں کی تحریریں شائع ہونے کے لیے آیا کرتی تھیں جو علمی، لسانی تحقیقی اور فکری جہتوں سے اعلیٰ سطح کی ہوتی تھیں اور پھر جام نور میں اچھے لکھنے والوں کی ایک ٹیم جمع ہو گئی-

ابوالفیض معینی :-اس میں ایک بات اور شامل کرنا چاہوں گا کہ اس میں جو نئے قلم کار تھے جو آپ کے ''تربیت گاہ لوح وقلم'' کے کالم میں لکھا کرتے تھے، ان پر کچھ تنقید کرتے ہوئے خاص طور پر میں نے اس چیز کا خیال رکھا تھا کہ ایسا کچھ نہ لکھا جائے جس سے ان کی دل شکنی یا حوصلہ شکنی ہو، بلکہ ان کی گرفت کرنے سے قبل ان کی تعریفیں کیں، ان کی حوصلہ افزائی کی اور پھر ایک اچھے اسلوب میں ان کی غلطیوں کو اجاگر کیا- آپ کے سوال کا تیسرا حصہ یہ تھا کہ خامہ تلاشی سے ہمارے طلبہ کو کیا فائدہ پہنچا؟ اس سلسلے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جام نور خاص طور پر جماعت اہل سنت کے اندر اور باہر بھی ہمارے طلبہ کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے وہ بہت کچھ سیکھتے ہیں، جام نور میں جب وہ کچھ پڑھتے ہیں تو اسے سند سمجھتے ہیں اور جب وہ خود کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو جام نور کی وہ بات ان کے ذہنوں میں ہوتی ہے اور پھر وہ اسے آگے بڑھاتے ہیں خواہ وہ علمی حیثیت سے ہو یا لسانی حیثیت سے- مثلاً آپ اداریہ لکھتے ہیں ان میں سے بہت سی ایسی فکریں یا جملے ہوتے ہوں گے جو انہیں اچھے لگتے ہوں گے، وہ انہیں نوٹ کرتے ہوں گے اور پھر آئندہ انہیں استعمال کرتے ہوں گے، اس کے علاوہ اور بھی اہل قلم ہیں جن کی فکروں اور زبانوں سے طلبہ استفادہ کرتے ہوں گے- اب اگر بہت سی ایسی باتیں جو علمی یا لسانی حیثیت سے غلط تھیں ان کی اصلاح نہ کی جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ غلط باتیں طلبہ کے ذہنوں میں بیٹھ جاتیں پھر ان غلط باتوں کو من وعن وہ آگے بڑھا دیتے-

خوشتر نورانی :-پوری دنیا میں جہاں جہاں جام نور پڑھا جاتا ہے وہاں عام قارئین سے لے کر بڑے بڑے علما و دانش وران تک کی ''خامہ تلاش'' کی شناخت کے حوالے سے مختلف آراء تھیں- ایک رائے تو یہ تھی اور یہی اکثریت کی رائے تھی کہ خامہ تلاش کوئی ایک شخص نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ بیک وقت مختلف علوم وفنون پر دسترس رکھنا،

زبان وادب پر گہری نگاہ رکھنا اور شعر وسخن کا خاصا درک رکھنا ان تمام صلاحیتوں کا کسی ایک شخص میں جمع ہونا بہت مشکل ہے- اس لیے یہ سمجھا گیا کہ اس کالم کو مختلف علوم وفنون پر مہارت رکھنے والے مل کر لکھتے ہیں- دوسری رائے یہ تھی کہ خود مدیر اعلیٰ ہی خامہ تلاش ہیں، تیسری رائے یہ تھی کہ مولانا اسید الحق ہی خامہ تلاشی ہیں- اس تعلق سے گھڑی کی سوئی مختلف لوگوں کی طرف گھوما کرتی تھی، اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

ابوالفیض معینی:- مجھے یاد ہے کہ ہماری جماعت کے ایک بڑے ذمہ دار عالم مفتی مطیع الرحمٰن رضوی صاحب سے ایک بار میری ملاقات ہوئی، ان کو بھی نہیں معلوم تھا کہ خامہ تلاشی میں لکھتا ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ ''یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی اتنے سارے علوم پر بیک وقت نظر رکھتا ہو کہ وہ حدیث واصول حدیث پر بات کر رہا ہے، شعر وسخن پر بھی بات کر رہا ہے اور ادب، تاریخ اور زبان پر بھی کلام کرتا ہے، اس لیے میں یہ نہیں مان سکتا کہ کوئی ایک شخص اس کو لکھتا ہے اور اگر کوئی ایک آدمی یہ کام کر رہا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان تین صفحات کو لکھنے کے لیے وہ پندرہ بیس دنوں تک اسی میں لگا رہتا ہوگا- یعنی رسالہ ملنے کے بعد بیس دنوں تک وہ پڑھتا رہتا ہوگا، لائبریریاں کھنگالتا ہوگا پھر جا کر یہ کام ہوتا ہوگا''- تو میں نے ان سے از راہ مذاق کہا کہ حضرت اگر کوئی آدمی دو دنوں میں یہ کام کرتا ہو تو پھر آپ کیا کہیں گے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ''پھر تو وہ اپنے زمانے کا عبقری ہوگا''- حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اتنی حیرت کی بات نہیں- مثلاً شعر وسخن اور عروض کے تعلق سے جو کچھ بھی میں نے تنقیدیں کیں وہ ایسی کوئی بہت علمی نہیں تھیں کہ ان پر حیرت کی جائے، اس کے علاوہ میرا تعلق ایک ایسے خاندان اور ایسی سرزمین سے ہے جہاں شعر وسخن کا خوب چرچا رہتا ہے، میرے گھرانے میں دسیوں شعرا گزرے ہیں اور میں بھی کچھ نہ کچھ تک بندیاں کر لیتا ہوں، جام نور میں شائع بھی ہوا کرتی ہیں تو جسے بچپن سے شعر وسخن کا شوق رہا ہے اور کسی نہ کسی حد تک فن سے بھی واقفیت ہے، اس کے علاوہ ادب کا مطالعہ بھی میں نے اپنے خارجی اوقات میں کافی کیا ہے تو یہ میرے لیے ناممکن سی چیز نہیں تھی- ان تمام چیزوں کے باوجود نہ تو مجھے ''ہمہ دانی'' کا دعویٰ ہے اور نہ ہی عبقریت کا زعم، میں تو آج تک اپنے آپ کو طالب

علم سمجھتا ہوں، اور جو کچھ بھی ہے اسے میں اللہ کا فضل سمجھتا ہوں اور خاص طور پر اپنے بزرگوں کی دعائیں کہ جو کام میں تن تنہا کر رہا تھا لوگ اسے ایک اکیڈمی کا کام گمان کر رہے تھے، خود میرے استاذ گرامی امام علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی صاحب بھی نہیں جانتے تھے کہ خامہ تلاشی میں لکھتا ہوں، انہوں نے فرمایا کہ ''بڑی حیرت کی بات ہے، ہندوستان میں تو مجھے ایسا کوئی شخص فی الحال نظر نہیں آتا جو بیک وقت ان تمام علوم وفنون پر دسترس رکھتا ہو۔''

خوشتر نورانی :- یہاں میں اپنے قارئین کو یہ بھی بتادوں کہ کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہیں خامہ تلاش کی شخصیت کا موہوم سا سراغ مل گیا تھا، اس لیے وہ خامہ تلاش کی اہمیت وصلاحیت کو کم کرنے کے لیے یہ افواہ اڑاتے پھر رہے تھے کہ کئی لوگ مل کر اسے لکھ رہے ہیں، مثلاً شعر وسخن کے لیے فلاں شاعر سے رجوع کیا جاتا ہے، حدیث کے لیے فلاں عالم سے، تفسیر کے لیے فلاں مفسر سے اور نقد کے لیے فلاں نقاد سے رجوع کیا جاتا ہے۔لیکن میں آپ کو بتادوں کہ ایسا کچھ نہیں تھا، میرے محبّ محترم مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری صاحب کسی کی طرف رجوع کیے بغیر نہایت پابندی سے دو برسوں تک خامہ تلاشی لکھتے رہے، ہاں! جب کبھی کوئی اہم صورت حال سامنے آگئی تو مشوروں کا تبادلہ ضرور ہوا۔ کسی بات پر شبہ ہوا تو کبھی کسی شاعر یا اہل علم سے ان کی رائے پوچھ لی لیکن میرا خیال ہے کہ ہر شخص کے ساتھ یہ صورت حال ہے، ان چیزوں سے اس کی صلاحیت پر حرف نہیں آتا۔

ابوالفیض معینی :- میں یہاں پر ایک حقیقت کا اعتراف کروں کہ خامہ تلاشی لکھنے کے وقت جہاں تک بات مذہبی معاملات کی تھی تو میرا اپنا مطالعہ کافی تھا، اس لیے میں خود طے کرتا تھا کہ مجھے کیا لکھنا ہے، ہاں کبھی ایسا ضرور ہوتا تھا کہ کسی لفظ کی تذکیر وتانیث کے سلسلے میں یا کسی شعر کے وزن کے سلسلے میں یا کسی ترکیب یا محاورے کے سلسلے میں جہاں کہیں مجھے تامل ہوا کرتا تھا تو میں اپنے کرم فرما اور مشفق جناب ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب سے فون پر مشورے کرتا تھا اور ڈاکٹر صاحب کافی اچھی رائے مجھے دیا کرتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہوسکا، لیکن بہرحال شعر وسخن کے

سلسلے میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے ضرور استفادہ کیا ہے۔

خوشتر نورانی: ۔یہ حقیقت کا اعتراف اپنی جگہ،لیکن پہلے کسی قابل گرفت مقام پر نظر رک جانا یہ بجائے خود اس بات کا اشارہ ہے کہ شعر وسخن میں آپ اچھی نظر رکھتے ہیں۔

ابوالفیض معینی:۔ہاں!یہ صحیح ہے کہ پہلے میری نگاہ خود رکتی تھی اور پھر اپنے اطمینان کے لیے میں ڈاکٹر صاحب سے رجوع کرتا تھا اور بہت محبت کے ساتھ وہ رہنمائی فرماتے تھے۔

خوشتر نورانی :۔اچھا یہ بتائیں کہ ہمارے ارباب علم ودانش اور قارئین کو کیوں ایسا لگتا تھا کہ کوئی ایک شخص اتنے علوم وفنون پر دسترس نہیں رکھ سکتا؟

ابوالفیض معینی:۔میں نے جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ میں اس کو عجوبہ نہیں مانتا، ایسا ہوسکتا ہے اور ہوا ہے۔ یہاں ایک بات اور بتادوں کہ خامہ تلاشی لکھتے وقت کبھی کبھی اتفاقات بھی ہوئے ہیں۔مثال کے طور پر ایک صاحب کا مضمون چھپا جس میں حضرت عمر فاروق کے ایمان لانے کے بارے میں ایک روایت تھی، میں نے وہ روایت پڑھی اور میرے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ اس روایت میں کچھ نقد اور کلام ہے، اتفاق سے میں اپنی لائبریری میں گیا تو محض اتفاقیہ طور پر علامہ شبلی کی ''الفاروق'' سامنے آگئی، میں نے سوچا کہ معاملہ حضرت عمر کے ایمان کا ہے لاؤ اسے بھی دیکھ لوں، جب اس کو دیکھا تو شاید آپ کو یاد ہوگا کہ پوری اٹھارہ یا بیس سطریں ہو بہو وہیں سے نقل کی ہوئی تھیں،تو ایسے اتفاقات بھی ہوئے ہیں۔ایک بات اور یہاں عرض کردوں کہ جب میں ایک شمارے پر تنقید کرتا تھا تو اگلے شمارے میں بعض خطوط آیا کرتے تھے کہ آپ نے فلاں جگہ غلطی تھی اسے چھوڑ دیا، وہ سارے خطوط آپ مجھے دکھایا کرتے تھے اور میں نے پڑھے۔اس تعلق سے عرض ہے کہ یہ کوئی بات نہیں ہوئی کہ جام نور کی ہر ہر غلطی پر ہم لکھیں، پھر کبھی ایسا ہوا کرتا تھا کہ آپ کے کسی قاری نے لکھا کہ فلاں بات قابل گرفت تھی آپ نے اس پر کیوں کچھ نہیں لکھا؟ تو میں آپ کو بتاؤں کہ بہت سے باتیں ایسی تھیں جو بالکل درست تھیں اور جنھوں نے ان پر تنقید لکھ کر بھیجی تھی وہ غلط تھی،تو ان پر تنقید نہ کرنے کی وجہ ایک تو یہ بھی تھی کہ میرے نزدیک وہ کوئی

ایسی غلطی نہیں تھی کہ جن پر تنقید کی جائے- دوسری وجہ یہ تھی کہ میں بھی ایک انسان ہوں او رانسان کی نظر کبھی چوک جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ میری نظر اس پر نہ پڑ سکی- تو یہ سمجھ لینا کہ ابو الفیض معینی ہر ہر سطر پر تنقید کرے ایسا ممکن نہیں تھا، پھر ہمارے پاس کل تین صفحات تھے اور تین صفحات میں ۶۴ رصفحات پر تنقید ہونا بڑا مشکل ہے- آپ کو یاد ہوگا کہ کبھی کبھی میں نے پانچ پانچ صفحات آپ کو لکھ کر بھیج دیے، آخر میں اسے تین صفحات میں لانا تھا تو پھر ہم لوگوں نے مل بیٹھ کر بہت سی باتیں نکالیں-

خوشتر نورانی:- خامہ تلاشی لکھتے وقت کبھی کبھی آپ اپنے اوپر یعنی مولانا اسید الحق پر بھی تنقیدیں کیا کرتے تھے، ایسا کیوں؟

ابوالفیض معینی:- (مسکراتے ہوئے) ظاہر ہے کہ ہمیں اپنا اصل نام چھپانا تھا ہمیں اس بات کا اظہار نہیں کرنا تھا کہ ابوالفیض معینی اسید الحق ہی ہے، اب اسید الحق کے نام سے ہر شمارہ میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا ہے اور اسید الحق کوئی فرشتہ تو نہیں ہے اس سے بھی غلطی ہوسکتی ہے، اگر میں اسید الحق پر تنقید نہ کرتا تو لوگ محسوس کرتے کہ ابوالفیض معینی اداریہ سے لے کر خطوط کے کالم تک ہر شخص پر تنقید کر رہا ہے لیکن اسید الحق سے اس کی کیا رشتہ داری ہے کہ وہ اسے رعایت دے رہا ہے- آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ کئی مرتبہ میرے یعنی اسید الحق کے نام سے جو مضامین شائع ہوئے، شائع ہونے کے بعد جب میں نے دوبارہ انہیں پڑھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مثال کے طور پر میں نے ایک بار ''قفص'' کا استعمال ''ص'' سے کر دیا تھا، لکھتے وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ اردو زبان میں قفس ''س'' سے ہوتا ہے، میں نے چونکہ عربی اور فارسی کافی پڑھی تھی اور ان دونوں زبانوں میں قفص ''ص'' سے استعمال ہوتا ہے- اس لیے میں نے اردو میں جب مضمون لکھا تو قفص ''ص'' سے لکھ دیا اور آپ نے بھی ''ص'' سے ہی اسے چھاپا، لیکن جب شائع ہونے کے بعد میں نے پڑھا تو مجھے تردد ہوا اور پھر میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اردو میں قفس ''س'' سے لکھا جاتا ہے- تو جو خود پر میں نے تنقیدیں کی ہیں ایسا نہیں کہ وہ غلطیاں میں نے جان بوجھ کر کیں اور پھر ان پر گرفت کی-

خوشتر نورانی :- آپ نے خامہ تلاشی کی شروعات ابوالفیض معینی کے نام سے کی، کیا اب آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنی شناخت کو چھپانے کے سلسلے میں آپ کا فیصلہ درست تھا؟

ابوالفیض معینی :- میرے خیال سے میرا فیصلہ بالکل درست تھا، اس لیے کہ ابتداءً میں اپنے نام سے لکھتا تو کچھ نہ کچھ تو دشواریوں کا سامنا ضرور کرنا پڑتا، اس کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں، جس کا میں اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتا- خامہ تلاشی جس وقت لکھی جا رہی تھی، اس وقت لوگ مجھ سے بھی پوچھا کرتے تھے کہ آخر یہ کون ہے؟ لیکن آپ میرے صبر و تحمل کی داد دیجیے، میری موجودگی میں لوگ آپ سے کتنا کریدتے تھے اور میں انجان بن جایا کرتا تھا (ہنستے ہوئے)-

خوشتر نورانی :- مجھے پورا احساس ہے کہ آپ کو کتنا تحمل سے کام لینا پڑتا تھا کہ آپ اپنی ہی چیز کو اپنی نہیں کہہ پا رہے تھے، آپ تو آپ رہے خود مجھے بھی بڑے صبر کا مظاہرہ کرنا پڑا، مجھے یاد نہیں آتا کہ میری اپنی زندگی میں کسی ایک چیز کے بارے میں لوگوں نے اتنی بار سوال کیا ہوگا، اگر کیا ہے تو وہ ایک سوال تھا کہ خامہ تلاش کون ہیں؟ میں جہاں بھی جاتا، خواہ سیمینار ہو یا جلسہ یا مخصوص محفل، لوگ یہی ایک سوال کرتے، نجی ملاقاتوں میں تو سوال کرتے ہی تھے، یہی سوال دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں سے فون اور خطوط کے ذریعے لوگ کرتے تھے- میرا آپ سے تعلق صرف ایک مدیر اور قلم کار کا نہیں تھا بلکہ بچپن سے گہرا دوستانہ اور برادرانہ تعلق رہا ہے، اس حیثیت سے مجھے لگتا تھا کہ کاش میں بتا سکتا کہ یہ کوئی اور نہیں خود میرے دوست اسید الحق ہی ہیں، خاص طور پر اس وقت جب خامہ تلاشی کا انتساب کئی افراد یا کسی خاص دوسرے فرد کی طرف کیا جاتا تھا- ایک مرتبہ مجھے یاد آتا ہے کہ ہمارے استاذ گرامی امام علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی صاحب قبلہ نے فرمایا کہ اب بتا ہی دو کہ آخر یہ کون ہے؟ میں اس وقت غلط بیانی سے کام نہیں لے سکا اور ہم نے اپنے اس معاہدے کو ایک طرف رکھ دیا جس میں ہم نے خامہ تلاش کی شخصیت کو چھپانے کا عہد کیا تھا، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! یہ کون ہو سکتا ہے؟ یہ آپ ہی کا ایک

پروردہ اور شاگرد ہوسکتا ہے اور پھر جب انہوں نے آپ کا نام سنا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بے حد خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ اسید الحق ہی ہو سکتے ہیں۔ بہر کیف! مذہبی اردو صحافت کی تاریخ میں اس کالم کو جو پذیرائی ملی ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ارباب علم و دانش جن میں یونیورسٹیز کے ادباء اور نقاد بھی شامل ہیں اس کالم کا موازنہ ماضی میں شائع ہونے والے ان تاریخی علمی اور ادبی کالموں سے کیا جنہوں نے اردو دنیا میں اپنی اہمیت کا لوہا منوایا، مثلاً، فیضی کی بانگ درا، مشفق خواجہ کا خامہ بگوش اور آزاد کی غبار خاطر وغیرہ۔

ابوالفیض معینی:- میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مجھ جیسے کسی نو آموز کی تحریر کو کوئی مولانا آزاد کی غبار خاطر اور مشفق خواجہ کے خامہ بگوش کے مقابلے میں پیش کر رہا ہو، بہرحال اس سے میرا حوصلہ کافی بڑھا۔ ایک بات اور ذکر کر دوں، ابھی آپ نے حضرت امام علم وفن کا تذکرہ کیا جو میرے اور آپ کے بھی استاذ گرامی ہیں۔ مجھے یہاں اعتراف کرنے میں ذرا بھی کوئی باک نہیں کہ آج جو کچھ بھی میں ہوں یا میری شخصیت سازی میں اور مجھے اس مقام تک پہنچانے میں، اگر کسی شخصیت کا ہاتھ ہے تو وہ ہمارے استاذ خواجہ مظفر حسین صاحب کا ہے اور اکثر ایسے موقع پر میں ایک شعر پڑھا کرتا ہوں کہ

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

خوشتر نورانی:- اس میں کوئی شک نہیں ہے، میں بھی اپنی تحریری اور صحافتی کامیابی کا سارا کریڈٹ انہی کو دیتا ہوں، اپنی زندگی میں جو پہلا مضمون لکھا انہی کی تربیت میں لکھا، جسے دیکھ کر انہوں نے کافی سراہا جس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔

خوشتر نورانی:- کبھی کبھی جام نور میں بڑے بڑے اہل قلم کے درمیان کسی مسئلے پر بحث چھڑ جایا کرتی تھی اور اس بحث کا سلسلہ مہینوں چلا کرتا تھا، اس وقت قارئین چاہتے

تھے کہ آپ فیصل کی حیثیت سے ان دو شخصیتوں کی تحریروں اور بحثوں کا محاکمہ کریں، لیکن ہم نے دیکھا کہ آپ نے کبھی فیصل بن کر محاکمہ نہیں کیا، اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟

ابوالفیض معینی :-اس کی دو وجوہات تھیں، کبھی کبھی تو میں موضوع کی نزاکت کو دیکھ کر ڈر جایا کرتا تھا، کبھی کبھی موضوع اتنا حساس اور نازک ہوا کرتا تھا کہ اس میں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل والی بات ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی نہ کبھی میرا نام سامنے آتا تھا اور اسید الحق کا اس موضوع پر کچھ لکھنا مناسب نہیں تھا، اس لیے میں اپنی رائے پیش نہیں کر سکا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اکثر ایسا ہوا کہ وہ دو متحاربین جو آمنے سامنے تھے ان سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے اور دونوں کو ہی یہ توقع ہوا کرتی تھی کہ میں ان کی حمایت کروں گا حالانکہ میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ میں نے کبھی بھی خامہ تلاشی لکھتے وقت تعلقات کی پرواہ نہیں کی، جب آپ سے رعایت نہیں کی تو پھر دوسروں کی بات ہی الگ ہے، لیکن پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیال کرنا پڑتا تھا، مثال کے طور پر جب ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب اور مفتی آل مصطفیٰ مصباحی صاحب کے درمیان بحث چھڑی، اب میرے جتنے گہرے تعلقات ڈاکٹر صاحب سے تھے اتنے ہی گہرے مفتی صاحب سے بھی تھے۔

خوشتر نورانی:-اور دونوں ہی یہ جانتے تھے کہ ابوالفیض معینی کون ہیں!

ابوالفیض معینی :-جی ہاں! دونوں ہی جانتے تھے اور دونوں کو یہ توقع تھی کہ میں ان کے موقف کی تائید کروں گا، حقیقت یہ ہے اس بحث میں نہ تو کلی طور پر میں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق رکھتا تھا اور نہ کلی طور پر مفتی صاحب سے، اب جب کہ وہ دونوں حضرات یہ انٹرویو پڑھیں گے تو محظوظ بھی ہوں گے (ان سے معذرت کے ساتھ) دونوں کی مجھے بعض باتوں سے اتفاق تھا اور بعض باتوں سے نہیں تھا تو میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ میں حتمی طور پر اپنی کوئی رائے یک طرفہ دے سکوں۔

خوشتر نورانی :-اب آخر میں ہمارے قارئین کو یہ بتا دیں کہ آپ نے یہ کالم لکھنا بند کیوں کر دیا؟ اس کالم کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب یہ کالم بند ہوا تو ردعمل میں زبانی، تحریری اور ٹیلی فونی شکایتوں کا انبار لگ گیا، بلکہ میں کہوں گا کہ ہاہا کار

مچ گئی، ان میں سے کچھ خطوط شائع بھی ہوئے، لیکن زبانی اور ٹیلی فونی شکایتوں کی تعداد شمار سے باہر تھی، اس کے بند ہونے کا افسوس کرنے والے نہ صرف عام قارئین تھے بلکہ بڑے بڑے دانشور، نقاد، علما، فضلا اور مشائخ بھی تھے۔

ابوالفیض معینی:-اس کو بند کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ زیادہ عرصے تک چلتا رہے گا تو اس کا جو اپنا Charm ہے ختم ہوتا جائے گا؟ تو اس سے پہلے کہ آپ کو یہ خط آنے لگیں کہ صاحب بہت ہو گیا اب بند کر دیجیے، اس سے پہلے میں ہی اسے بند کر دوں، میرا خیال ہے کہ ایک ہی طرح کی چیز آدمی پڑھتے پڑھتے اوب جاتا ہے اور پھر وہ اچھی نہیں لگتی۔ تو اس سے پہلے کہ آپ یہ کہتے (ہنستے ہوئے) کہ میں آپ سے باز آیا اور اب آپ خامہ تلاشی بند کر دیجیے، میں نے خود ہی وہ سلسلہ بند کر دیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خامہ تلاشی ایک اچھا وقت لیا کرتی تھی، غور وفکر اور اچھی خاصی محنت طلب کرتی تھی، کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ میری نظر کسی ایک لفظ پر رک گئی اور پھر میں اس کی تحقیق میں پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تک لگا رہا، چھ آٹھ گھنٹوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بات صحیح تھی۔ اسی طرح کبھی کسی حدیث میں مجھے لگا کہ کچھ کلام ہے اور پھر اس کی تحقیق میں رات رات بھر کتابیں کھنگالتا رہا اور صبح معلوم ہوا کہ وہ حدیث صحیح تھی اور میری محنت برباد گئی۔ ان کے علاوہ آپ جانتے ہیں کہ میری خود کی بہت ساری تحریکی، دعوتی، تقریری، تحریری اور علمی مصروفیات ہیں جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے مجھے ایسا لگنے لگا کہ میں اب بہت زیادہ توجہ اس کالم پر نہیں دے سکتا اور جب تک اس پر بھرپور توجہ نہ دی جائے اس معیار کی تحریر ہم نہیں لکھ سکتے جس کا یہ کالم متقاضی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس حوالے سے یہ مصرع بھی پڑھا......ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے کام تھے۔ پھر سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس کالم کے شروع کرنے کا جو ہمارا مشترکہ مقصد تھا وہ پورا ہو چکا تھا، ہم نے اپنے نو آموز قلم کاروں اور طلبہ کو یہ شعور دے دیا کہ تنقید اس اسلوب میں بھی ہو سکتی ہے، نقد و نظر کا مطلب صرف تحقیر یا تنقیص نہیں ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا، یہ بات شاید کہنے کی نہ ہو کہ

اس کے بعد کئی رسالوں نے اس قسم کے خطوط اور تحریروں کو شائع کرنا شروع کیا جس میں تنقید کی جاتی تھی اور ان تحریروں میں کئی بار تو پورے پورے جملے جو خامہ تلاشی میں لکھے تھے وہ استعمال کرنا شروع کر دیے، گویا ہم مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے- آپ کے قلم کار بھی محتاط ہو گئے اور قارئین میں تنقیدی شعور بھی بیدار ہو گیا، لہٰذا اس کو مزید کھینچنا مناسب نہیں تھا-

خوشتر نورانی:- آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے کہ آپ نے اپنے قیمتی اوقات میں سے چند لمحے ہمیں اس انٹرویو کے لیے دیے-

ابوالفیض معینی :- میں بھی آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے جام نور کے تین صفحات پر مجھے حکمرانی کرنے کا موقع دیا (مسکراتے ہوئے) اور ان پر میں نے جو چاہا لکھا اور آپ کی محبت ہے کہ آپ نے اسے شائع بھی کیا اور ایک بار پھر قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے اتنی محبتیں دیں اور اتنی حوصلہ افزائی کی- آخر میں پھر وہی جملہ دہرانا چاہوں گا کہ خامہ تلاشی کے کسی لفظ سے کسی بھی قاری کی علما و مشائخ کی اور ادارے کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں بڑی وسیع القلبی کے ساتھ ان سے معذرت چاہوں گا-

خوشتر نورانی:- چلتے چلتے یہ بھی بتا دیں کہ مستقبل میں ہم آپ سے یہ توقع رکھیں کہ آپ کچھ نیا شروع کریں گے؟

ابوالفیض معینی :- (ہنستے ہوئے) نئی چیزیں تو آپ لے کر آتے ہیں، خامہ تلاشی کا خیال بھی سب سے پہلے آپ ہی کو آیا تھا، اب پھر آپ کوئی نئی چیز سوچیے تو ان شاء اللہ اس پر غور کیا جائے گا-

(شمارہ جولائی ۲۰۰۷ء)

❏❏❏

مؤلف ایک نظر میں

نام: اسید الحق محمد عاصم قادری

پیدائش: مولوی محلہ بدایوں (یوپی)، ۲۳ر ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ/ ۶ر مئی ۱۹۷۵ء

والد گرامی: حضرت شیخ عبد الحمید محمد سالم قادری

جد محترم: حضرت مولانا عبد القدیر قادری بدایونی ابن تاج الفحول مولانا عبد القادر قادری بدایونی ابن مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی

تعلیم:
(۱) حفظ قرآن
(۲) فاضل درس نظامی
(۳) فاضل دینیات الہ آباد بورڈ، اتر پردیش
(۴) فاضل ادب عربی الہ آباد بورڈ، اتر پردیش
(۵) الاجازۃ العالیۃ، شعبۂ تفسیر وعلوم قرآن، جامعۃ الازہر الشریف مصر
(۶) تخصص فی الافتاء، دار الافتاء المصریۃ قاہرہ مصر
(۷) ایم۔اے۔علوم اسلامیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

مشغلہ: تدریس، تبلیغ، تحقیق، تصنیف

خادم التدریس مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں

ڈائرکٹر الازہر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز بدایوں

بانی رکن دی نیو ایج میڈیا اینڈ ریسرچ سینٹر دہلی



قلمی خدمات

مقالات و مضامین: تقریباً ساٹھ مقالات و مضامین ہند و پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں:

تصنیف:
(۱) حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعے کی روشنی میں (مطبوعہ)
(۲) قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ (مطبوعہ)
(۳) احادیث قدسیہ (مطبوعہ)
(۴) اسلام، جہاد اور دہشت گردی (زیر طبع)
(۵) اسلام اور خدمت خلق (زیر طبع)
(۶) جدید عربی محاورات و تعبیرات (زیر طبع)
(۷) تحفظ توحید کے نام پر کتب اسلام میں تحریف (زیر ترتیب)
(۸) مسائل تقلید و اجتہاد (زیر طبع)
(۹) خامہ تلاشی (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
(۱۰) تذکرۂ شمس مارہرہ، (مطبوعہ)
(۱۱) قصیدۂ فرزدق تمیمی ایک تحقیقی مطالعہ (مطبوعہ)
(۱۲) افہام و تفہیم (زیر طبع)
(۱۳) وارثین انبیا (زیر طبع)

ترتیب و تقدیم:
(۱) تذکرۂ ماجد (مطبوعہ)
(۲) خطبات صدارت مولانا مفتی عبدالقدیر قادری بدایونی (مطبوعہ)
(۳) مثنوی غوثیہ مولانا مفتی عبدالقدیر قادری بدایونی (مطبوعہ)
(۴) علوم حدیث (مطبوعہ)
(۵) ملت اسلامیہ کا ماضی، حال، مستقبل مولانا حکیم عبدالقیوم قادری بدایونی (مطبوعہ)
(۶) اکمل التاریخ، مولانا یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی (مطبوعہ)
(۷) تذکرۂ نوری، مولانا غلام شبر نوری (مطبوعہ)
(۸) قصیدتان رائعتان، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں (مطبوعہ)

ترجمہ، تخریج، تسہیل، تحقیق:

(۱) احقاق حق (فارسی) مولانا فضل رسول بدایونی (مطبوعہ)

(۲) عقیدۂ شفاعت مولانا فضل رسول بدایونی (مطبوعہ)

(۳) مناصحۃ فی تحقیق مسائل المصافحۃ (عربی) مولانا عبدالقادر بدایونی (مطبوعہ)

(۴) الکلام السدید فی تحریر الاسانید (عربی) مولانا عبدالقادر بدایونی (مطبوعہ)

(۵) تحفۂ فیض (فارسی) مولانا عبدالقادر بدایونی (زیر طبع)

(۶) طوالع الانوار (تذکرۂ فضل رسول) مولانا انوار الحق عثمانی بدایونی (مطبوعہ

(۷) اکمال فی بحث شد الرحال (فارسی) مولانا فضل رسول بدایونی (مطبوعہ)

(۸) مکاتیب فضل رسول (فارسی) مولانا فضل رسول بدایونی (زیر طبع)

